ماهنامة مجله

حیاتِ نو

بلریاگنج

FEB. 87

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

جلد ۲ شمارہ ۲

فروری سنہ ۱۹۸۷ء

مدیر منتظم نور محمد فلاحی

مدیر طارق فارقلیط فلاحی

○ مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ○

●

قیمت فی شمارہ	۳ روپے
سالانہ تعاون	۳۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

دفتر مجلہ حیات نو، بلریا گنج اعظم گڈھ، یوپی

شاداب آفسیٹ پریس ٹانڈہ ۲۷۶|۳۱ کتابت عبدالرحیم اعظمی

نقوش حیات نو

اداریہ		
ایس آئی او کی پہلی کل ہند کانفرنس	ایڈیٹر	۳
بحث و نظر		
مسودہ توبہ پر ایک مختصر نوٹ	مولانا خلیل احسن ندوی	۷
تعلیم کے سلسلے میں بنیادی نقطۂ نظر ۲	مولانا غلام یحییٰ انجم	۱۱
غیر عربی زبان میں ذکر و دعا و خطبۂ جمعہ کی شرعی حیثیت	عبدالحمید ندوی	۲۳
نصب العین ۲	سراج عالم رشی	۳۳
فتنۂ استشراق	محمد رضی الاسلام ندوی	۱۸
طب اسلامی	عبدالباری فلاحی	۵۴
احوال واقعی		
اجودھیا میں مسجد کی بازیابی کی مہم		۴۹
وقت کی آہٹیں		
بنگلور میں ۱۲ دن	طارق انور قلیط فلاحی	۳۹
شعر و نغمہ		
قرآن مجید	ابوالمجاہد زاہد	۳۲
ابیات	عطا عابدی	۳۳
غزل	مجاز نوری	۳۳
تعارف و تبصرہ		
اقامت دین کا کام کہاں اور کیسے؟	ادارہ	۶۱
حلقۂ یاراں	عبیداللہ فہد فلاحی	۶۲
جامعہ کے لیل و نہار	ادارہ	۶۳

اداریہ

SIO کی پہلی کل ہند کانفرنس

ایس آئی او مسلم طلبہ و نوجوانوں کی ایک ملک گیر تنظیم ہے جو نہایت منظم اور فعال ہے۔ اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

- طلبہ اور نوجوانوں میں دین کا صحیح علم و شعور پیدا کرنا۔
- اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قیامت تک کے لئے جو مستند ہدایت نامہ اور مکمل ضابطۂ حیات بھیجا گیا ہے اس کے مطابق انھیں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی گذارنے کے لئے آمادہ کرنا۔
- معروف (بھلائیوں) کے فروغ اور منکر (برائیوں) کے ازالہ کے لئے انھیں آمادہ کرنا۔
- ملک کی عام طلبہ برادری اور نوجوانوں کو تنظیم کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرانا۔ اور ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ان کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرنا
- افراد کی فکری، دینی و اخلاقی تربیت کا اہتمام کرنا، ان کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینا اور انھیں تحریک اسلامی کے لئے مفید تر بنانے کی کوشش کرنا۔

SIO انھیں مقاصد کے حصول کے لئے کئی سال سے جد و جہد کر رہی ہے۔ وہ اس کے کارکن ہندوستان کے گوشے گوشے میں ایک فعال رول ادا کر رہے ہیں۔ وہ ایک منظم قوت اور مضبوط جماعت بن چکی ہے اس کو نظر انداز کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ طلبہ اور نوجوان غلط راہوں پر سرپٹ بھاگے جا رہے ہوں، ان کی کوئی منزل نہ ہو، ان کا کوئی رہنما اور رہبر نہ ہو اور وہ تباہی، بربادی اور ہلاکت کے قریب پہنچ گئے ہوں، ان کو اچھے کردار اور اونچے مقاصد کیلئے ابھارنا، دعوت دینا، منظم کرنا اور ان کی تربیت اور تزکیہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن SIO نے اپنے قیام کے بعد تین سال کی اس قلیل مدت میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ نوجوانوں کے ایک خوش آئند مستقبل کا پتہ دیتی ہے اور امید کے کتنے چراغ جلاتی ہیں۔

خوبصورت پارکوں، رنگ برنگ پھولوں اور ہرے بھرے درختوں کے شہر بنگلور میں ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ۵ ویں کل ہند کانفرنس نے ایس آئی او کو اور زیادہ فریش، واضح اور روشن کر دیا ہے۔ اب تک دنیا دو عظیم اور طویل جنگوں کا مزہ چکھ چکی ہے اور اب ایک تیسری عالمگیر اور بھیانک جنگ کے بیچ پڑ طول رہی ہے۔ روس اور امریکہ اس کے ٹھیکیدار مسلسل جنگ کے شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں اور ایران و عراق بھی ان کے جلائے ہوئے آگ میں مسلسل جل رہے ہیں۔ افغانستان کی سرزمین، بے گناہ، نہتے معصوم افغان عوام کے خون سے لالہ زار بن گئی ہے اور سُرخ سامراج کا خونیں بھیڑیا اپنی مسلسل خون بہائے جا رہا ہے، اور خود ہمارا ملک نفرت، عداوت، دشمنی، قوم، زبان، علاقہ کی آگ میں مسلسل جل رہا ہے اور آگ بار بار بھڑکائی جا رہی ہے۔ پوری عالم انسانیت چیخ پکار، نالہ و شیون اور آہ و بکا میں لگی ہوئی ہے، اور تباہی و بربادی کے بادلوں نے چاروں طرف سے اس کو گھیر لیا ہے۔ ایسے وقت میں اسلام کو امن، ترقی اور نجات کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے پیش کر کے ایس آئی او نے بڑی ذمہ داری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے ۶۰ ہزار نمائندوں نے جس صبر و ضبط، عزم و ہمت، نظم و ڈسپلن، اخوت و محبت، یگانگت و بھائی چارگی کا ثبوت دیا وہ قابل تقلید اور لائق مثال ہے۔ کانفرنس کی عظیم اور ہمہ گیر کامیابی پر ہم ایس آئی او کے طلبہ، نوجوانوں اور کارکنوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے تعارف اور طلبہ و نوجوانوں کی تنظیم میں ہر تن اور ہر لحظہ لگے رہیں گے، اور دشمنی کی ہوا اپنے خون جگر سے تیز کرتے رہیں گے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

روس نے امن کا نام ایک سازش کے تحت لیا ہے؟

افغانستان کی تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ روس کے اشارے پر نجیب اللہ نے یک طرفہ اعلان جنگ بندی کر دیا ہے اور اسے ۱۵ جنوری ۱۹۸۷ء سے نافذ کر دیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس دوران اگر پاکستان سے کوئی مداخلت ہو گی تو روسی افواج تیزی سے افغانستان سے جانا شروع ہو جائیں گی، ورنہ مخالفین کو طاقت پکڑنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

دوسری طرف افغان مجاہدین کی سات پارٹی گروپوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ روس اور افغانستان کے

درمیان حتمی فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا اور ہم اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک روس کا ایک سپاہی بھی افغانستان میں ٹھہرا رہے گا اور جو بھی روس سے مفاہمت کرے گا وہ غداری کا مرتکب ٹھہرے گا اور معاف نہیں کیا جائے گا۔

افغانستان پر حملہ کر کے روس کو اپنی قلمرو میں شامل کرنا ہو، یا اس کے ذریعہ سمندر کی آبی گذرگاہوں پر قبضہ کرنا، یا پاکستان کو آنکھیں دکھانا یا عرب ممالک کے تیل کے چشموں پر تالیقی ہونا یا، کمیونسٹ انقلاب کو وسعت دینا، بہرحال روس کا ایک خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ افغانستان کے پہاڑوں میں، دیہ کے نیچے ناہموار راستوں میں نہتے، غیور، شوق شہادت سے سرشار افغان مجاہدین نے روس کے سپر طاقت ہونے کے غرور کو اس طرح توڑا کہ روس آج دنیا کے لئے تماشہ اور عبرت بن گیا ہے۔ اور افغان مجاہدین جد و جہد، قربانی، سرفروشی، ہمت و جرأت بہادری و جانبازی کی مثال بن گئے اور ساری دنیا کے سروں کو اپنے سامنے عقیدت سے جھکا دیا۔ این سعادت بزور بازو نیست ؛ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ، فالحمد للہ علیٰ ذالک

آج سے سات سال پہلے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو روس نے افغانستان کو نرم چارہ سمجھ کر حملہ کر دیا۔ اس نے سوچا کہ چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں کا معاملہ ہے جب افغانستان ہمارے قدموں میں ہوگا اور ہم اس کے سیاہ و سپید کے مالک ہوں گے۔ لیکن افغان مجاہدین نے اس کو ایسے دھکے دئے اور ایسے چرکے لگائے کہ اس کے ہوش ٹھکانے لگے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سیدھے سادھے انداز میں وہ اپنی فوجوں کو ہٹانے کے بجائے اب بھی چالیں چل رہا ہے اور امن کے نام پر جنگ کو مزید طول دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ بڑے شاطرانہ انداز میں یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور اس کو نافذ بھی کر دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی فوجوں کو پیچھے واپس بلاتا اور افغان عوام کو سہولت کا موقع فراہم کرتا کہ وہ جس نظام کو چاہیں اختیار کریں اور جس کو چاہیں منتخب کریں لیکن وہ چاہتا ہے کہ

(۱) امن کے نام پر رائے عامہ کو گمراہ کیا جائے اور اپنے حق میں رائے عامہ کو تبدیل کیا جائے۔

(۲) مجاہدین (باغیوں) کے خلاف پروپگنڈہ کے ذریعہ باور کرایا جائے کہ جنگ کو یہی طول دینا چاہتے ہیں اور رائے عامہ کو ان کے خلاف تبدیل کیا جائے۔

(۳) مجاہدین کے درمیان ان کی صفوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں اور ان کو اس کے نام پر ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کی جائے۔

مجاہدین کو مدد فراہم کرنے والے ذرائع کو گمراہ کیا جائے اور مدد کے راستوں کو محدود اور حتی الامکان ختم کیا جائے۔ افغان مہاجرین سے ذرائع ابلاغ اور عوام کی ہمدردیاں ختم کی جائے اور ان کو بے دست و پا کر دیا جائے تاکہ وہ افغانستان کو لوٹ آئیں۔ روسی اور افغان فوجوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے اور ان کو ازسرنو منظم کیا جائے۔ روس کے اندر بڑھتے ہوئے اسلامی شعور، لہروں اور مظاہروں کو روکا جائے۔ اور پھر ایک بھرپور اور کامیاب کارروائی کے ذریعہ افغانستان پر مکمل کنٹرول کر لیا جائے اور مجاہدین کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جائے۔

افغان مجاہدین کا عہد کہ جب تک روس کا آخری سپاہی افغانستان سے نہیں جائے گا وہ لڑتے رہیں گے اور فیصلہ میدان جنگ ہی میں ہوگا۔ اس بات کا غماز ہے کہ وہ روس کی شاطرانہ چالوں کو سمجھ رہے ہیں اور اس بات سے کم کسی چیز پر راضی نہیں کہ روس اپنی فوجوں کو واپس بلائے اور افغانستان کا اقتدار اہل اس کے عوام کے حوالے کرے۔ ان کا یہ موقف مناسب بھی ہے اور قابل مبارکباد بھی۔ ہم تمام ہندی مسلمان اور عوام ان کے ساتھ ہیں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو۔

طارق فارقلیط فلاحی
۱۹۸۶/۱/۱۳

(بقیہ علم الاستشراق)

دفن کیا جائے اور ان کی دعوت و تلقین میں جو بد نیتی، مذہبی و سیاسی مقاصد شامل ہیں ان کو مشت از بام ایسا نہ کرنے کی صورت میں مستشرقین کی علمی سیادت برقرار رہے گی۔ ان کی کتابوں کو مرجع کی حیثیت حاصل رہے گی۔ اس طرح ایک طرف مغربی تعلیم یافتہ مسلمان الحاد و تشکیک میں مبتلا رہیں گے اور دوسری طرف اسلام کا مطالعہ کرنے والے غیر مسلم بھی ان کی کتابوں کے واسطے سے اسلام سے بدگمان رہیں گے۔

(بقیہ تعلیم)

اس روایتی ذخیروں میں جگہ دی گئی تو شاید اسلام کے ساتھ انتہائی زیادتی ہوگی جسے آنے والی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ زمان و مکان یا پھر ان کے ذریعہ پیدا ہونے والے واقعات کو اسلام پر اثر انداز سمجھا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بدلتے ہوئے نظریات کے آئینے میں اسلام کو دیکھا جائے بلکہ ہماری مراد صرف اور صرف یہ ہے کہ بدلتے ہوئے نظریات

مطالعۂ قرآن

مولانا جلیل احسن ندوی؟

سورہ توبہ پر ایک مختصر نوٹ

"استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء میں ہم لوگوں کو سورہ توبہ شروع کرائی اور ایک مختصر تجزیاتی نوٹ لکھایا۔ سورہ توبہ کو سمجھنے کے لئے یہ نوٹ نہ صرف معاون و مددگار بلکہ قرآن کے طلبہ کے لئے ایک قیمتی سرمایہ بھی۔ ہم افادہ عام کے لئے اس کو حیات نو کے صفحات میں منتقل کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ مولانا کی شخصیت برصغیر ہند و پاک میں واحد شخصیت تھی جو قرآن کے رموز و نکات پر گہری نظر رکھتی تھی۔"

(طارق فارقلیط فلاحی)

غزوۂ خندق تک کی تمام لڑائیوں میں مومنین اور نبی کو غلبہ حاصل ہوا اور کفار کی فوج کو ہر لڑائی میں حسرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ غزوہ خندق کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنین سے کہا کہ اب مشرکین اس پوزیشن میں نہیں رہے کہ وہ ہم پر حملہ کریں۔ اب ہم حملہ کرنے کی پوزیشن میں آگئے ہیں۔ یہ ۶ھ کا واقعہ ہے اور ۶ھ میں آپ ۱۴۰۰ آدمیوں کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے نکلے۔ اس موقع پر مشرکین کا چراغ سحری بھڑک اٹھا۔ انھوں نے مزاحمت کی اور پھر باہمی گفتگو کے نتیجہ میں وہ معاہدہ ہوا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کی دفعات الوثائق السیاسیہ میں تفصیل سے دیکھنا چاہئے۔ یہ معاہدہ ۱۰ سال کے لئے ہوا تھا اور اس کی دفعات میں سے ایک دفعہ یہ ہے کہ ملک عرب کا ہر قبیلہ آزاد ہے چاہے تو وہ مکی کیمپ میں شامل ہو یا مدنی کیمپ میں۔ اس معاہدہ کی رو سے بنو خزاعہ محمدی کیمپ میں شامل ہو گئے کیونکہ نبی کی سیرت اور حسن معاملہ پر سب کا اتفاق تھا۔ خزاعہ کے مومنین اور کافرین سب کے سب معتقد تھے اور یہ قریش کے پڑوس میں رہتے تھے اس لئے قریشی لیڈروں کو یہ بات بہت کھلی کہ خزاعہ محمدی کیمپ میں شامل ہو گئے۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ ہماری ہر جنگی کارروائی اور سکیم کی اطلاع مدینہ ان کے ذریعہ پہنچ جایا کرے گی۔ اس لئے قریشی لیڈروں نے بعض مشرک قبائل کو

بھلا اگر ہماری پوزیشن تو ذرا نازک ہے تم لوگ جماعت اسلحہ کی رو سے خزاعہ پر سوتی رات میں حملہ کردو
چنانچہ انھوں نے سوتے ہوئے لوگوں پر حملہ کیا اور بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مریضوں پر بھی رحم
نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے مسجد حرام میں پناہ لی انھیں وہیں مسجد حرام میں قتل کیا۔ اس
صورت حال کو دیکھ کر مسعود ابن عمرو خزاعی اپنی تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر مدینہ کو چلے گئے
اور یہاں آکر نبی کو شعر کی زبان میں اس حادثے کی اطلاع دی۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر
بیٹھے تھے سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا لا نصرنی اللہ ان لم انصرکم (خدا میری مدد نہ کرے
اگر میں تمھاری مدد نہ کروں)۔

ابو سفیان نے دیکھا کہ مسعود نہ مردوں میں ہے نہ زندوں میں ہے ہو نہ ہو وہ مدینہ کو خبر
دینے گیا ہو، تو ان کو بڑی پریشانی ہوئی اور وہ سیدھے مدینہ چلے آئے اور مدینہ پہنچنے کے بعد اپنی بیٹی
ام حبیبہ رض کے گھر پہنچے اور بستر بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے جھپٹ کر بستر کھینچ لیا
اور کہا کہ رسول اللہ کے بستر پر اللہ اور رسول کا دشمن نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے بعد پھر اور لوگوں سے
ملے، علی رض، ابو بکر رض، عمر رض سب کے پاس گئے، مقصد یہ تھا کہ یہ معاہدہ برقرار رہے اور اگر نہ برقرار رہے
تو نیا معاہدہ ہو جائے۔ تو ابو سفیان کے مدینہ پہنچنے سے پہلے سورہ توبہ کی ابتدائی آیتیں نازل
ہوئیں جو (۱ — ۲۲) آیتوں پر مشتمل ہیں۔ ان آیات میں سورہ انفال کی آیت (فانبذ
الیهم علی ....) کی رو سے مشرکین کو یہ ان کا معاہدہ پھینکا جا
رہا ہے اور ان کو چار مہینہ کی مہلت دی جا رہی ہے کہ اس عرصہ میں اچھی طرح غور و فکر کر لو اگر
اسلام لے آئے تو ٹھیک ورنہ مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ چار مہینہ کی مدت گذرنے
کے بعد جہاں پاؤ پکڑو، قتل کرو، ان کی معاشی ناکہ بندی کرو، ان کی گھات میں بیٹھو اور خبردار
ان سے نئی صلح نہیں ہو سکتی۔ ان کے لئے تین راستے ہیں (۱) یا تو یہ عرب اسلامی مقبوضات سے
باہر چلے جائیں (۲) یا اسلام لائیں (۳) یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

عام طور پر تمام اہل تفسیر اور اصحاب سیر متفق ہیں اس بات پر کہ یہ ابتدائی آیتیں ۹ھ
میں نازل ہوئی ہیں لیکن مولانا شبلی جب سیرت لکھ رہے تھے تو ان کو سخت تردد ہوا اور کسی طرح
یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ آیتیں ۹ھ میں اتری ہیں، تب انھوں نے مولانا فراہی سے پوچھا

مولانا فراہی نے جو جواب دیا افسوس ہے کہ اس کی نقل موجود نہیں ہے۔ مولانا شبلی نے اپنے مکتوبات
میں جو سوال کیا ہے وہ یہ ہے۔

"سورہ براءۃ کے متعلق ایک امر نہایت اہم اور اساس مباحث عظیمہ ہے یعنی یہ سورہ کب اتری
اور صحاح ستہ میں فتح مکہ کے بعد اس کا زمانہ ہے یعنی ۹ھ میں۔ لیکن بظاہر صلح حدیبیہ کو جب کفار
نے توڑ ڈالا ہے اس کے بعد اور اسی کے متعلق یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سورہ میں مسجد حرام کے
پاس جو معاہدہ ہوا تھا اس کا صاف ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ مسجد حرام کے پاس حدیبیہ کے سوا اور
کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا لیکن فتح مکہ کے وقت تمام اہل مکہ مطیع ہو گئے اور پہلا معاہدہ بالکل
بے تعلق ہو گیا، پھر کوئی دوسرا معاہدہ نہیں ہوا اس لئے اگر یہ سورہ ۹ھ میں اتری تو اس کا
تعلق کس معاہدہ سے ہے"؟

مولانا فراہی کا جواب تو معلوم نہیں ہے لیکن ان کے دونوں شاگرد (مولانا امین احسن اصلاحی، اختر احسن اصلاحی)
متفق ہیں اس بات پر کہ توبہ کی ایک تا ۲۲ آیتیں فتح مکہ سے پہلے (کم از کم چار مہینہ پہلے) نازل ہو چکی تھیں۔

سورہ انفال اور توبہ میں تعلق یہ ہے کہ انفال میں قتال کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے اور توبہ
میں قتال کا۔ غالباً اسی معنوی اتصال کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کے آغاز میں بسم اللہ
نہیں لکھوائی۔ سورہ توبہ کا مرکزی مضمون معلوم ہو جانے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ سورہ مختلف
دور میں نازل ہونے والی آیات کا مجموعہ ہے۔ ۱ تا ۲۲ فتح مکہ سے پہلے، ۲۳ تا ۳۷ فتح مکہ کے
بعد، ۳۸ تا ۸۰ غزوۂ تبوک ۹ھ کی تیاری کے زمانہ میں نازل ہوئی، ۸۱ تا ۱۲۶ تبوک سے
واپسی پر مدینہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئیں، ۱۲۷ تا آخر مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئیں۔

سورہ کا نام سورہ توبہ ہے اس لئے کہ اس میں مشرکین سے، اہل کتاب سے اور منافقین
سے بھی توبہ کا مطالبہ کیا گیا ہے، اگر وہ برے انجام سے بچنا چاہیں۔ نیز اس کا دوسرا مشہور نام
سورۃ البراءۃ ہے جس کے معنی علیحدگی اور بے تعلقی کے ہیں یعنی یہ کہ اگر تم لوگ ایمان نہیں لاؤ گے اور
سچے مسلمان نہیں ہو گے تو تم سے براءۃ کی جائے گی جس کے دوسرے معنی اعلان جنگ کے ہیں۔ شروع
سے لے کر آیت ۱۱۹ تک کلام میں بڑی شدت ہے اور آخری حصہ میں یہ شدت (۱۲۰ تا آخر) لینت
اور نرمی سے بدل گئی ہے کیونکہ اصل مقصود لوگوں کا ٹھیک ہونا ہے نہ کہ ان کو جہنم میں ڈالنا ہے۔

۱۔ ۲۲ میں مشرکین مکہ کے معاہدے کو ان پر پھینکا گیا ہے اور ان کو چار مہینے کی مہلت دی گئی ہے، مدت ختم ہونے کے بعد ان سے قتال کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہ نئی صلح نہیں ہو سکتی۔ مومنین کو ان سے قتال پر ابھارا گیا ہے۔

۲۳ تا ۲۷ میں نبی اور مومنین کو نصرت کا یقین دلایا گیا ہے بشرطیکہ اعلائے کلمۃ اللہ کی محبت ہر طرح کی محبتوں پر غالب رہے نیز توکل کی تعلیم دی گئی ہے۔ حنین کی لڑائی کے پس منظر میں۔ ۲۸ اہل کتاب جن کی طرف نبی کی بعثت براہ راست نہیں ہوئی ہے ان سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ البتہ ان کو ایک رعایت یہ ملی ہے کہ وہ جزیہ دے کر اور اسلامی مملکت کے وفادار شہری بن کر اسلام کی حکومت میں رہ سکتے ہیں۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور اپنے معابد اور اپنے حلقوں اور اپنوں میں اپنے دین کی تبلیغ آزادی سے کر سکیں گے۔ جیسا کہ حضور اور خلافت راشدہ کے تعامل سے ثابت ہے۔ اس کے بعد آخر میں شمسی اور قمری مہینوں کو ملا کر جو ایک جنتری بنائی گئی تھی جس کے نتیجہ میں حج ہمیشہ گرمی کے مہینہ میں کھجوروں کی فصل کٹ جانے پر حج کو جما دیا گیا تھا اس کو منسوخ کر دیا گیا۔

۳۸ تا ۱۰۰ میں تحریک کی بنیاد پر ابھارا گیا ہے اور خاص طور پر منافقین کی پردہ دری کی گئی ہے جو تندرست اور مالدار ہونے کے باوجود تبوک جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اسی لئے اس سورت کا نام سورۃ الفاضحہ (رسوا کرنے والی) بھی ہے۔ ۱۰۱ ــ ۱۱۶ میں نبی کو ہدایت دی گئی ہے کہ منافقین سے کس طرح نمٹیں اور نبی کے مدینہ پہنچنے سے پہلے جو لوگ تائب ہو چکے تھے ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا گیا اور کعب ابن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کے اندر غلطی کا احساس پوری طرح نہیں ابھرا تھا اس لئے نبی کو ان کے بائیکاٹ کا حکم دیا گیا، چنانچہ بائیکاٹ کے بعد جب مطلوب حد تک توبہ ابھر آئی تو آیہ ۱۱۷ میں ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان آیا۔ ۱۲۷ تا آخر خاتمے کی آیتیں ہیں۔

(بقیہ طب اسلامی)

سورج کی روشنی کو ظاہر کیا جبکہ اس کا اجالا غائب ہو چکا تھا۔ یہ علوم چاند کی مانند درخشاں ہو گئے اور یورپ کے دور وسطیٰ کی تاریک ترین رات کو منور کیا۔ کچھ روشن ستاروں نے اپنی روشنی سے لوگوں کو مستفید کیا۔ بالآخر ایک نئے دن کے طلوع پر یعنی نشاۃ ثانیہ کی آمد پر چاند اور ستارے ایک ساتھ غائب ہو گئے کیونکہ یہ عظیم تحریک کے تعارف اور اس کی رہنمائی میں ان علوم کا اہم رول تھا جسے بے دخلی

مولانا غلام یحییٰ انجم۔ علی گڑھ

تعلیم کے سلسلے میں بنیادی نقطہ نظر (۲)

یورپی نصاب تعلیم میں زمان و مکان کے اعتبار سے تبدیلیاں

شاید یہی وجہ ہے کہ مغربی علما زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم میں ترمیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی ہر سال تو نہیں ہوتی مگر تین چار برس میں ضرور اس کی طرف توجہ کرتے ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں علم سماجی عمل کے وسیع تصور کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے جیسے وہ مشعل راہ بنا کر زندگی کی راہ عمل پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ ہمارے علما قرآن و حدیث کی تفہیم میں جدید نکات کو بیان کرتے ہیں مگر درسی کتابوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے طلبہ جدید تحقیقات سے کورے اور نابلد رہ جاتے ہیں۔ مغربی ماہرین تعلیم نے جو طریقۂ تعلیم اختیار کیا ہے وہ صرف مفید ہی نہیں بلکہ بار آور بھی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کے دو اہم فائدے یہ ہیں کہ اولاً افہام و تفہیم میں آسانی پیدا ہوتی ہے اور ثانیاً برسوں کا کام مہینوں میں ہونے لگتا ہے لہٰذا اگر ہم اپنے ذہن و شعور کی طاقت سے تعلیمی مشکلات کو دور نہیں کر سکتے ہیں تو مغربی منہج تعلیم کے انداز میں ضرور اپنی تعلیم کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ منہج تعلیم کے سلسلے میں میری یہ تقلید "من تشبہ بقوم" کی زد میں نہ آئے گی۔

مغربی علما نے جو اس قدر ترقی کی ہے مجھے مکمل اعتماد ہے کہ اگر وہ اس ترقی یافتہ دور میں آٹھ سو برس پرانے نصاب تعلیم میں سر کھپاتے تو عروج و ارتقا کی اس منزل پر نہ پہنچتے مگر نہیں انھوں نے زمانے کی ضرورت کو محسوس کیا اور اسی قالب میں تعلیم کا نصاب ڈھالا اور طریقۂ تعلیم کا جدید طرز ایجاد کیا جس کی بنیاد پر آج تعلیمی معاملہ میں تمام ممالک سے سبقت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیلپ کے ہتی ان کے قدیم کلچر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مسلم اسپین میں سڑک کے دونوں طرف روشنی کا استعمال اس وقت کیا جاتا تھا جب لندن کی، جو صدی بعد پیرس میں لوگوں کے پاؤں کیچڑ سے آلودہ رہتے تھے۔"

اس زمانہ میں یہ عبارت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تاریخی حقیقتیں ہیں جنہیں بہرحال

تسلیم کرنا پڑے گا۔ حکیم ابن مقنع نے مصنوعی چاند بنایا تھا جو پندرہ دن مسلسل ایک کنویں میں طلوع ہوتا تھا لیکن ابن المقنع کے مرتے ہی اس کی ساری تحقیقات بھی سپرد خاک ہو گئی کاش اس نے معاصرین کو اس تحقیق سے آگاہ کیا ہوتا یا اسے کسی کتاب میں قلم بند کر دیا ہوتا تو یہ تاریخی حقیقت ایک فسانہ نہ بنتی، لیکن ایسا ہی ہوا اور صرف اسلاف کے فضائل کیوجہ سے ہوا۔ اس کے برعکس اہل مغرب نے اپنے تعلیمی منہج کو نئی دریافتوں اور نئی ایجادات سے لیس کر دیا گویا کہ یہ نصاب مغرب کے تعلیمی منہج کا ارتقائی سفر ہے اور محقق آسانی کے ساتھ اس ارتقائی سفر کے منازل کا خاکہ کھینچ سکتا ہے۔

جب ہم اپنے نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ چند مخصوص کتابوں کی تدریس کو درس نظامی کا نام دے دیا گیا ہے اور یہ نام لیتے ہی چند روایتی کتابوں کا تصور ذہن میں آجاتا ہے جو قدیم زمانے سے میراث کی طرح ہمارے طلبہ میں منتقل ہوتی رہتی ہیں یاں! علامہ حریری اور بدیع الزماں ہمدانی کے مصنفہ مقالات کی ادبیت سے ہمیں انکار نہیں یقیناً یہ مقامات عربی ادب میں ایک شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن غور فرمائیں کہ یہ بیسویں صدی ہے اس زمانے میں ڈرامے، افسانے مختصر دلچسپ کہانیاں بے حد ترقی کر چکی ہیں اور ہمارے یہاں ڈرامے کی ابتدائی شکل یہ مقامات اب تک زیر تدریس ہیں، ہمارے طلبہ ابو تمام، متنبی، بحتری کا نام تو جانتے ہیں مگر انھیں نزار قبانی، الیاس ابو شبکہ محمد ابو ریشا پھر حافظ و شوقی کے بارے میں پوچھا جائے تو شاید ہی جواب دے سکیں گویا کہ ہمارے مدارس میں عربی ادب کبھی جاہلی اموی اور عباسی دور تک ہی میں رک کر رہ گیا ہے اور ٹھہر گیا ہے جب کہ عثمانی دور کے بعد اور بھی دو دور گزر چکے ہیں۔

عربی نظم کی تمام کتابیں زکار رفتہ تو نہیں مگر پرانی ضرور ہو چکی ہیں، حماسہ، دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ بیشک اہم کتابیں ہیں لیکن ایک پوری کتاب کو شامل درس رکھنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ قدیم و جدید شعراء کے دواوین کے انتخابات پڑھائے جائیں تاکہ طالب علم عربی شاعری کے مختلف ادوار اور اس دور کے شعراء کے ارتقائی مزاج سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اس کے علاوہ وہ مضامین جو ہمارے نصاب میں شامل ہیں مگر علوم آلیہ کی اہمیت رکھتے ہیں مثلاً نحو، صرف، معانی بیان اور عروض وغیرہ میرا یہ مشورہ قطعاً نہیں کہ انھیں آؤٹ آف کورس کر دیا جائے بلکہ ان مضمون سے متعلق جو کتابیں شامل درس ہیں ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، ابتدائی درجے سے کر سند

فراغت کی تحصیل تک ایک طالب علم نحو و صرف کی تعلیم حاصل کرتا ہے مگر زندگی کا ایک اہم حصہ اس میں صرف کر دینے کے بعد چند موٹی موٹی اصطلاحوں تک محدود رہتا ہے لہٰذا میرا اپنا نظریہ یہ ہے، کافیہ اور شرح جامی جیسی مشکل ترین کتابیں نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ اصل مقصود تک پہنچنے کے لئے مضر بھی ہیں کیونکہ طالب علم سارا وقت اس کی پیچیدہ گتھیوں کے سلجھانے میں صرف کر دیتا ہے اور نتیجہ لاحاصل ہوتا ہے یا صرف وقتی طور پر دل کو مطمئن کر لیتا ہے اور جب! اب تو نفس مسئلہ سمجھانے کیلئے عرب ممالک میں اس موضوع پر زمانہ کے مطابق بہت کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن سے جدید فن کا بڑی ہی آسانی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

علوم عقلیہ میں منطق و فلسفہ پورے نصاب درس پر حاوی ہے موجودہ نصاب تعلیم میں جتنی کتابیں اس موضوع پر شامل درس ہیں اور کسی فن میں نہیں، صغری و کبریٰ سے لے کر "قاضی مبارک" اور "صدرا" تک شمار کرتے چلے جائیے ایک لمبی فہرست ہو جائے گی، اس دور میں نہ تو منطق پڑھانے کا وہ جذبہ رہا اور نہ طلبہ کی اس کے حصول میں دلچسپی رہی نصابی خانہ پری کے تحت اسے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ جعل بسیط، جعل مرکب، علم باری تعالیٰ اور کلی طبعی کا وجود فی الخارج وغیرہ جیسے اہم مباحث ہیں جس میں ایک طالب علم الجھ کر رہ جاتا ہے اور منطق کے خاص مسائل کی طرف بہت کم متوجہ ہو پاتا ہے ہاں ایک دور تھا جب اس فن سے لوگوں سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، مگر اب وہ دور نہیں لہٰذا اب ایسی کتابوں کو درس میں شامل رہنے دینا دماغ سوزی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ البتہ وہی کتابیں داخل درس رہیں جو منطق و فلسفہ کے مبادی اور اس کے اصول و ضوابط سے متعلق تشنگی بجھا سکیں نیز منطق و فلسفہ کے عالمی تصور کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان کتابوں کا اضافہ کیا جائے جو ان فنون کی نئی جہتوں کو سامنے لاتی ہیں اور معنویت عصر کے شواہد روشن کی حیثیت میں مفید مقصد بن جاتی ہیں۔

علوم اسلامیہ میں تفسیر و حدیث کو نصاب درس میں بڑی اہمیت حاصل ہے مگر ہماری درسگاہوں میں جس طرح ان مقدس علوم کی تعلیم دی جاتی ہے وہ عیاں ہے، تفسیر میں وہی کتابیں داخل درس ہیں جو قدیم زمانہ میں عصری تقاضوں کے مطابق لکھی گئی تھیں، آج وہ زمانہ نہیں پھر بھی انھیں کتابوں سے استفادہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے قرآن مقدس کی

ایک ایسی تفسیر کی ضرورت ہے جو اس دور کے مقتضیات پر حاوی ہو۔ اگر کوئی تفسیر ہماری اس ضرورت کو پورا کر رہی ہو تو اسے داخلِ نصاب میں جھجک نہیں محسوس کرنا چاہیے۔

احادیث میں بخاری و مسلم انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی عظمت اور جلالت قدر سے کسی مومن کو انکار نہیں۔ ان مقدس کتابوں اور احادیث کے دوسرے مجموعوں میں گویا وہ سارے عنوانات بکھرے ہوئے ہیں، جو کامل ترین اور کامیاب ترین زندگی کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ آج کا توجیہ پسند اور تجزیہ طلب مزاج زمانہ زندگی کو جن عنوانات کے ماتحت سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے وہ سنت نبوی کے بے کراں ذخیرے سے نکھار دیئے جائیں تو احادیث شریف کا مطالعہ ایک نئی اہمیت اور ایک نئی معنویت اختیار کر لے گا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ فہم و فراست کی ہر دور میں ایک سطح رہی ہے، جس کے دائرے اپنے ہیں اور اس کا مزاج رہا ہے۔ ان چیزوں کو نظر میں رکھنا افہام و تفہیم کی خاطر انتہائی ناگزیر ہے۔ ہاں البتہ مغربی معیاروں کے سامنے سر جھکانا یقیناً ایک مردہ ذہنی غلامی کی علامت ہے جو قرآن کریم کے نزدیک قابل مذمت اور ناقابل قبول ہے۔ ذخیرۂ احادیث میں سے بخاری شریف کو جو قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ جامع رہنما کتاب کہی جاتی ہے، اگر اس کتاب کو از سر نو نئے عنوانات کے تحت مرتب کر دیں اور اس کی توجیہ و تشریح ان علمی اصطلاحات کی مدد سے کر دیں جو آج کی دنیا میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہے تب اس مقدس مجموعہ کا معنوی جمال اور رہبری و رہنمائی کے واضح اشارے زیادہ موثر اور کارگر بن جائیں گے۔

الغرض میری مراد تمام فنون سے ہے جو علوم آلیہ ہیں، انہیں صرف مبادی تک محدود رکھا جائے اور جن علوم سے دین کا گہرا ربط ہے ان کی بھرپور اور ٹھوس تعلیم دی جائے مگر طریقۂ تعلیم میں اس کا لحاظ ضرور رکھا جائے کہ نصوص قرآنیہ اور احادیث کو کلاسیکل انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کے بجائے عصری تقاضوں کے مطابق ان کی توجیہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حس پرست عقلوں کے لیے بھی یہ توجیہ قابل عمل ثابت ہو سکے۔ اگر علوم اسلامیہ کو عصری تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کریں گے اور افہام و تفہیم کی یہ راہ مسدود کر دیں گے تو علوم اسلامیہ میں جمود و تعطل کا یہ سلسلہ روایتی محبوب کے زلف کی طرح سے طویل تر ہوتا

چلا جائے گا اور نتیجہ بالکل صفر ہوگا۔ مثلاً یہی کہ قرآن میں جہاں پانی جل جائے گا کا مفہوم آیا ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے جسے اعمی ذہن رکھنے والا طبقہ قطعاً مان لینے کے لیے تیار نہ ہوگا تو اس کو ہم نصابی جمود سے نکل کر عصری علوم کی روشنی میں اس طرح سمجھائیں گے کہ پانی دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک "آکسیجن" اور دوسرا "ہیڈروجن"۔ "آکسیجن" کا کام بھڑکانا اور ہیڈروجن کا کام بھڑکنا ہے۔ پانی انہیں دو گیسوں میں مرکب ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پانی کی ترکیب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بٹ جائے گی نتیجۃً ہیڈروجن جل جائے گا اور آکسیجن بھڑکائے گا یہ بات دیکھنا ہے لیکن جمود سے ہٹ کے عصری علوم کا سہارا لے کر سمجھانے کی کوشش کی تو یہ سادہ سی توجیہ دل پذیر بھی ہوگی اور احساس پرست عقلوں کے لیے قابل قبول بھی۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں علوم اسلامیہ کے ساتھ علوم عقلیہ کا تجرباتی حصہ بھی اگر نصاب درس میں شامل کر لیا جائے تو موجودہ دور کی رہنمائی بھی ہوگی اور نصوص قرآنیہ و احادیث کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اگر ہم اتنی وسعت کے ساتھ علوم اسلامیہ کی تشریح و توضیح میں کام نہ لیں گے تو ظاہر ہے ہمارا یہ جمود وہیں کھینچ کر لے جائے گا جہاں سے چل کر ہم یہاں تک پہونچے ہیں۔ اس لیے کہ یہ متفق علیہ ہے کہ اب نہ کسی نئے مذہب کے آنے کا امکان اور نہ کسی دوسرے نبی کے آنے کی گنجائش ہے خواہ وہ نبی ظلی ہو یا بروزی ہر دو طریقوں کی راہیں مسدود ہیں۔ اس بنیاد پر اسلام کی توضیح و تشریح میں اتنی وسعت ضرور ہونی چاہیے کہ عصر کے بدلتے ہوئے نظریئے اور ثابت ہونے والی ٹھوس حقیقتیں اس کے اندر سما سکیں۔ اگر بالفرض اس گنجائش سے مذہب اسلام کو محدود کر دیا جائے تو بدلتے ہوئے حالات میں ایک اور نبی کے ساتھ ایک جدید الہامی کتاب کی ضرورت ہوگی (والعیاذ باللہ) جو شرعاً محال ہے اور نقلاً کفر بواح۔ لہٰذا اگر ہم موجودہ تقاضوں کے مطابق اسلام کو سمجھانے کی کوشش نہ کریں گے تو مستشرقین چند ہی دنوں کے اندر اسلام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیں گے اور اب بھی ان کا یہ سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری ہے۔ اسلام کے اکثر نظریات کو انھوں نے اپنی مرضی کے مطابق کر لیا جس کی وضاحت کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اسی طرح ہاتھ پاؤں سمیٹے روایت کا گن گاتے رہیں گے تو وہ دن دور نہیں کہ مستشرقین اسلام

کی تصویر مسخ کر ڈالیں گے اور ہمیں اس کا احساس بھی نہ ہو پائے گا، لہٰذا اب ہماری درسگاہوں میں ایسے افراد کی بھی ضرورت ہے جو جدید و قدیم دونوں طرح کے علوم سے بہرہ مند ہوں تاکہ مستشرقین کی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرکے ان کے معائب کی نشاندہی کریں اور نئی اجتہادی بنیاد قائم کریں بقول خرم جاہ مراد

"علمی طور پر ہمیں مغرب کے علمی چیلنج کا صرف مقابلہ ہی نہیں کرنا ہے بلکہ ایک طرف ایسا زلزلہ لانا ہے کہ مغرب کے علم کی بنیادیں ہل جائیں۔ وہ بنیادیں جو علمی زندگی سے خدا کے اخراج، رسالت سے استغنا، وحی سے اعراض اور انسانی عقل کو سب کچھ مان لینے پر قائم ہیں،" بقول اقبال

دنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

جو عالم افکار مغرب نے تعمیر کیا ہے اس کو ہلانے کے لیے جس مہدی کی ضرورت ہے وہ آپ ہی کے اندر موجود ہے بشرطیکہ آپ اپنے متعلقہ علم میں غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کے ساتھ اجتہادی صلاحیت پیدا کریں۔ اگر آپ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اسلام کی تصویر مسخ ہونے سے بچا لیں گے اور اس طرح آپ کو اس جذبہ کو بروئے کار لانے کی توفیق رفیق حاصل ہو گی جو آپ کے اعماق قلب میں جلوہ گستر ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ نہ تو ہمارے علماء کو یہ معلوم ہے کہ مستشرقین نے کیا لکھا اور نہ مستشرقین کے متاثرین ہی کو معلوم ہے کہ اصل مصادر کیا ہیں حیرت ہے کہ علوم اسلامیہ پر انگریزوں کی کتابیں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں اور مسلمان فضلاء کی کاوشوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں علوم اسلامیہ کا جدید تقاضوں کی روشنی میں ایسا نصاب مرتب کرنا ہوگا جو مستشرقین کی ہفوات و اباطیل کا جائزہ لے سکے اور ان کی دسیسہ کاریوں کی بھی نشاندہی کر سکے اور آنے والی نسل کے لئے ایک ایسا نصاب تیار کر سکے جس کا سرچشمہ محض اسلامی مصادر ہوں اور مستشرقین کی من گھڑت ملمع سازیوں سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

یہ یاد رہے کہ اسلام کے وسیع دائرہ میں جدید تقاضوں کے سمونے کے بجائے اگر ہم نے

(بقیہ ص ۶ پر)

محمد رضی الاسلام ندوی
اے، ایم، یو
علی گڑھ

فتنۂ استشراق

مغرب کے ان اہل علم کو جنھوں نے اسلامیات کے مطالعہ کو اپنا موضوع بنایا اور اسلامی علوم اور مسلمانوں کی مشہور علمی تصنیفات سے استفادہ کرکے اسلامیات پر اظہار خیال کیا انھیں ہم مستشرقین یا اورینٹلسٹ (ORIENTALIST) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مستشرقین کی تاریخ بڑی پرانی اور استشراق کی ابتدا بہت مجہول ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلہ کا آغاز یورپ کے ان راہبوں اور پادریوں کے ذریعہ ہوا جنھوں نے اندلس کے عظیم علمی گہوارہ میں رہ کر وہاں کی درسگاہوں میں علمی نشو و نما پائی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جن لوگوں کا نام ملتا ہے ان میں دسویں صدی کے اواخر میں مشہور فرانسیسی راہب جربرٹ (JERBERT) بارہویں صدی کے اوائل میں پطرس اور بلدی برٹ اور اسی صدی کے اواخر میں گریمون (GRARMONDE) قابل ذکر اور شہرت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد مستشرقین کا سلسلہ اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک مستشرقین کے سامنے اسلام کی جو تصویر رہی وہ انتہائی گھناؤنی اور خلاف واقعہ تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی تصنیفات میں اسلام کی طرف وہ چیزیں منسوب کی جاتی رہیں جنکے خلاف اسلام نے جہاد کیا اور برسرپیکار رہا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام خرافات کا مجموعہ، بت پرستی کی طرف دعوت دینے والا خونریز و خون آشام مذہب تھا۔ اسلام سے اسی قدر شدید نفرت کا سبب ان مستشرقین کی (جن میں سوائے چند کے سب کے سب یہودی یا عیسائی ہیں) دینی عصبیت ہے جسمیں صلیبی جنگوں میں شکست فاش کے نتیجے میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈومینیو کونی کی کتاب "دین حق کی تلاش" میبوکیون کی "میتھالوجی آف اسلام" (METHALOGY OF ISLAM) جولیان کی "تاریخ فرانس" گلوور کی "عالمی تشریعوں کی ترقی" اور دیگر مستشرقین کی کتابیں اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

۱۸ ویں صدی کے وسط سے مستشرقین ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ اس عہد میں جابجا عربی مدارس قائم کئے گئے اور ان مدارس میں عربوں کی تصانیف کی تدریس ہونے لگی۔ دوسری طرف

بہت سی عربی تصنیفات کا مغربی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح مستشرقین کو براہ راست عربی کتب سے استفادہ کا موقع ملا جس کی وجہ سے اسلام سے بدگمانی میں کسی قدر کمی ہوئی اور سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے مستشرقین نے اپنے خیالات کے لئے عربی تصانیف کو بنیاد بنایا۔

اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یورپی سامراج کی مدد سے مستشرقین کی ایک بڑی تعداد وجود میں آگئی جنہوں نے سیاسی تسلط کے زیر سایہ اسلامی ممالک میں السنۂ مشرقیہ کے مدارس کی بنیاد ڈالی، مشرقی کتب خانے قائم کئے، ایشیاٹک سوسائٹیوں کی بنیاد ڈالی، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کئے۔ اس طرح مشرقی تصنیفات کا کثرت سے ترجمہ ہوا۔ پھر انھوں نے اسلامیات کو موضوع بحث بنا کر ان کے سلسلہ میں اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا۔

مستشرقین کے اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہونے اور اسلامیات پر قلم اٹھانے کے بہت سے محرکات وعوامل ہیں۔ اور اس سلسلہ میں بہت سے مقاصد ان کے پیش نظر رہے ہیں۔

(۱) مستشرقین کا پہلا محرک صلیبی جنگوں کی پیدا کردہ ذہنیت کے تحت عیسائی افکار ونظریات کو اسلام کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لئے تعصبات کی دیواریں حائل کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے اسلام پر ثقافتی، تکنیکی اور منطقی حملے کئے، عیسائیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلام دراصل عیسائیت کی مسخ شدہ یا بگڑی صورت ہے۔ وہ عیسائیت اور یہودیت سے ماخوذ ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے زمانے کے بعض یہودیوں اور عیسائیوں اور ان کی کتب مقدسہ سے استفادہ کرکے ان میں کمی زیادتی، رد وبدل واضافہ کرکے قرآن بنا ڈالا۔ مثال کے طور پر منٹگمری واٹ کے نزدیک بعثت سے قبل آنحضرت کا غار حرا جانا، راہبوں سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا اور انہی کے نزدیک اسلامی دعوت کی ابتدا میں ورقہ بن نوفل کی تائید اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے بعد کی اسلامی تعلیمات ورقہ کے افکار سے متاثر نظر آتی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک

(۲) دوسرا محرک اسلامی ممالک کو نوآبادیات بنانے کی سازش ہے۔ مسلم ممالک کو استعمار کے شکنجے میں جکڑنے، اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور اسلامی سلطنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کیلئے اسلام کے قانونی وسیاسی نظام میں شکوک وشبہات پیدا کئے، تاکہ تعمیر معاشرہ وسیاست کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات بالکل معطل ہوکر رہ جائیں۔

(۳) مستشرقین کی سرگرمیوں کا تیسرا مقصد اسلام سے ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں، مغالطوں اور شبہات میں مبتلا کرنا ہے۔ اس طرح مخالفین کو تین فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ یہ کہ وہ استعماری فکر وتہذیب کے سامنے سرنگوں ہوگئے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ کسی حد تک ان کو ان کے عقائد میں پیوست کرنے کا موقع ملا، اور تیسرا فائدہ یہ کہ کمزور ایمان کے مسلمان الحاد وتشکیک میں مبتلا ہوگئے۔

(۴) مستشرقین کا ایک مقصد عالم عرب اور دنیائے اسلام کی طرف بدحالی وپسماندگی منسوب کرنا ہے، اس طرح وہ مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ دراصل ان کی بدحالی وپسماندگی کا سبب اسلام ہے۔ اس طرح وہ اسلامی نظام اور اسلامی تاریخ کے بارے میں شبہات کے بیج بودیتے ہیں۔

(۵) مستشرقین اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے خائف ہیں اس لئے ان کی تحقیقات کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ اسلام کو OUT OF DATE ثابت کردیں جو چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اب عصر حاضر کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال اور ان کی توجیہات اور آپ کی قیادت ورہنمائی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ دور جاہلیت کی اصلاح کے لئے تو موزوں تھا مگر آج کے زمانے کے لائق نہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے اور ان محرکات کے پیش نظر مستشرقین نے قرآن، سیرت نبوی، فقہ وکلام، صحابہ وتابعین، ائمہ ومجتہدین، محدثین وفقہاء، اور مشائخ وصوفیاء کی سیرتیں، فن جرح وتعدیل، اسماء الرجال، حجیت حدیث، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء، الغرض اسلامیات سے متعلق تمام موضوعات سے تعرض کیا اور ان میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان موضوعات میں مستشرقین نے کیا کیا شبہات ظاہر کئے ان کے بیان کے لئے تو کئی ضخیم مجلدات درکار ہیں مگر ان سب کا حاصل — جیسا کہ ڈاکٹر مصطفٰی سباعی نے اپنی مشہور کتاب "السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي" میں بیان کیا ہے — یہ ہے کہ اسلام کی ایسی تصویر کشی کی گئی کہ اسلام کے اہداف ومقاصد اور اسلام سے متعلق ہر چیز سے مسلمان بدظن ہوجائیں اور مسلم علماء واکابرین اور قدیم اسلامی شخصیتوں سے بدگمانی پیدا ہوجائے، قدیم زمانوں اور خاص طور پر پہلی صدی کے اسلامی معاشرہ کی اس طرح تصویر کشی کی گئی جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس زمانہ میں انانیت کا شکار رہتے تھے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام کے تمام مستشرقین نے اپنی تصنیفات میں اسلام کے خلاف زہر افشانی کی ہے یا مستشرقین کی تمام تصنیفات اسی نہج پر لکھی گئی ہیں۔ یہاں اس چیز کا اعتراف ضروری ہے کہ بعض مستشرقین نے بغیر کسی سیاسی یا دینی محرک کے محض اپنے علمی ذوق و شغف کی بنا پر اپنی زندگیاں اسلامیات کے مطالعہ کے لئے وقف کردیں اور بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان انصاف پسند اور معتدل مستشرقین میں ساخو، آرنلڈ، اسٹانلی لین پول، اسپرنگر اور ونسنک وغیرہ قابل ذکر ہیں مگر ان سے بھی ہمیں اس وقت بدگمانی ہو جاتی ہے جب دیکھتے ہیں کہ یہی مستشرقین جنھوں نے اسلامیات کے سلسلہ میں غیر جانبدارانہ طور پر ایسی خدمات انجام دیں جن سے خود مسلمان قاصر ہے وہی دوسری جگہ اسلام اور رسول اسلام کے خلاف زہر اگلنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی اور البیرونی کی کتاب الہند کا محققانہ مقدمہ لکھا مگر یہی مصنف دوسری جگہ اسلام پر انتہائی رکیک حملے کرتے ہے۔ مارگولیتھ نے چھ ضخیم جلدوں میں مسند احمد بن حنبل شائع کی اور اس پر مقدمہ لکھا مگر اس نے سیرت رسول پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کذب و افتراء اور تاویل و تعصب کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ اسپرنگر نے ابن حجر کی الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ کو طبع کرایا مگر اس نے بھی حضورؐ کی سیرت پر جو کتاب لکھی وہ دوسرے مستشرقین کی کتابوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ونسنک نے "مفتاح کنوز السنۃ" کے نام سے انتہائی دقیقہ سنجی کے ساتھ صحاح ستہ کا انڈکس تیار کیا جس پر وہ قابل مبارکباد ہے مگر یہی مصنف انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں آنحضرتؐ کے خلاف شبہات پیدا کرنے میں اپنے بھائیوں سے کم نہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے مستشرقین نے جو طریقہ کار اپنایا اور جس معیار بحث کو اپنے لئے متعین کیا وہ انتہائی نامعقول، علمی امانت و دیانت کے خلاف، علمی دنیا میں اجنبی، نامانوس اور تحقیقی میدان میں انتہائی غلط اور نامناسب ہے۔ مثال کے طور پر ہم ان کے چند طریقہ کار کی طرف اشارہ کریں گے۔

(۱) وہ نصوص کو اپنے خود ساختہ نظریہ اور من مانی خواہشات کے تابع کر دیتے ہیں۔

(۲) بالقصد نصوص میں تحریف کر دیتے ہیں اور اگر تحریف کی گنجائش نہ ہو تو عبارت کا غلط مطلب

نکال لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بروکلمان نے اپنی کتاب "تاریخ الاسلامیۃ" میں کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ والی مشہور حدیث میں لفظ رعیۃ سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل عرب عجمیوں کو بکریوں کے ریوڑ کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

(۳) مآخذ و مصادر کے بارے میں اپنا ذاتی فیصلہ ٹھونستے ہیں۔ چنانچہ وہ ادبی کتاب کے حوالے نقل کرکے اسے حدیث کے مباحث میں چسپاں کر دیتے ہیں اور کتب تاریخ کے حوالے دیکر فقہی مسائل میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

(۴) یہ لوگ اسباب و علل کے اختراع اور حوادث کے بنانے میں بہت زیادہ افراط سے کام لیتے ہیں جس پر سوائے تخیلات کے کوئی سند نہیں ہوتی۔

(۵) یہ لوگ عرب اور مشرق کے رسم و رواج اور عادات و اخلاق کو اپنے اوہام و خیالات کی کسوٹی پر دیکھتے ہیں اور انھیں کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ فرانسیسی نو مسلم مستشرق دینانٔ دینیہ نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے کہ مستشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات و رجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھ سکیں۔"

(۶) مستشرقین کے اصول تنقیح شہادت مسلمانوں کے اصول سے بہت مختلف ہیں۔ وہ ضعیف روایت کو لے کر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں اور اس کی تقویت کے لئے شاذ و غریب احادیث کو پیش کرتے ہیں اور انھیں مشہور و مستند احادیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ضعیف روایت ان کی خواہشات کے مطابق ہو۔ مثلاً گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے کہ حدیث کی تدوین تیسری صدی میں ہوئی اور عہد اول کے مسلمان احکام اسلام تو کیا اسلام کی ابتدائی تعلیم سے بھی واقف نہ تھے۔ استدلال کے طور پر دمیری کی کتاب الحیوان سے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو یہ تک نہ معلوم تھا کہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں۔

(۷) کسی چیز کی بحث و تحقیق سے قبل اس کے سلسلہ میں اپنے ذہن میں ایک متعین رائے قائم کر لیتے ہیں۔ پھر وہ دلائل ان کی اس رائے کے موافق ملتے ہیں انھیں قبول کرتے ہیں خواہ ان کا علمی مقام کچھ بھی ہو اور جو چیزیں ان کے مخالف ہوں ان سے بالکل تعرض نہیں کرتے۔ گویا وہ ناقابل اعتبار ہیں۔

مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے انھیں لوگوں پر زبردست چوٹ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ بدطینت لوگ علم کے نام پر جو تحقیقات کرتے ہیں اس میں پہلے ہی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہر حال منزل من اللہ تو نہیں ماننا ہے۔ اب کہیں نہ کہیں سے اس امر کے ثبوت بہم پہنچانا ہے کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں پیش کیا ہے۔ یہ فلاں فلاں مقامات سے چرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اس طرز تحقیق میں یہ لوگ اس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھن آنے لگتی ہے، اور آدمی کو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اس پر اور اس تحقیق پر۔"

مستشرقین کے اسلوب اور طرز تحقیق کے سلسلہ میں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کے بارے میں کوئی شبہہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنی غیر جانبداری، عدم تعصب، علمی امانت اور معروضی مطالعہ کا زور شور سے تذکرہ کریں گے پھر اسلام کے بہت سے محاسن اور خوبیاں بیان کریں گے، حتی کہ جب قاری ان کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جائے گا تو وہ بڑے ہی مکر و فریب سے اپنا زہر سرایت کرنے لگیں گے اور قاری کے دل میں اسلام کے بارے میں کوئی شبہہ پیدا کر دیں گے۔ مستشرقین سے جو چیز ہمارے سیکھنے کی ہے وہ یہ کہ وہ کسی ایک فن کو یا کسی فن کے ایک گوشے کو ریسرچ کرتے ہیں، اس کیلئے اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں، اس موضوع پر تمام مراجع کا مطالعہ کرکے اپنی تحقیق کو علمی ڈھنگ میں پیش کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں تمام مطبوعہ و قلمی مراجع کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کو مراجع کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

مستشرقین کے اس زہر کے تریاق کے لئے اور ان کے اسلام دشمن اور تخریبی اثرات کا ازالہ کرنے کیلئے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ایجابی اور سلبی دو کاموں کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے، ایک تو یہ کہ اسلامی اور علمی موضوعات پر صحیح و مستند اسلامی معلومات فراہم کرکے ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت، مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی، اور عمیق مآخذ کے استناد و وسعت اور طرز استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق ہوں، اور دوسری طرف مستشرقین کا علمی محاسبہ کرکے ان کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی وضاحت کی جائے۔ مآخذ کی کمزوری اور نتائج کی غلطی کو

(بقیہ ص ۴۹ پر)

عبد المجید ندوی

غیر عربی زبان میں ذکر و دعا اور خطبۂ جمعہ کی شرعی حیثیت

غیر عربی زبان میں ذکر و دعا اور خطبۂ جمعہ کا مسئلہ ہمیشہ سے فقہائے اسلام کا موضوع رہا ہے اور آج بھی اس کی اہمیت بعض اعتبارات سے غیر معمولی ہے۔ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا رہا ہے کہ یہ بلا کراہت جائز ہے یا کراہت کے ساتھ، اور کراہت بھی تحریمی یا تنزیہی؟ سطور ذیل میں اس کی وضاحت کی جا رہی ہے:۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے بطور تمہید یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ذکر و دعا کے محل دو ہیں ایک اندرون نماز، اور دوسرے بیرون نماز۔

تمام اہل علم یہ بات جانتے ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرأت قرآن سے لے کر اندرون نماز کے تمام اذکار مطلقاً غیر عربی زبان میں جائز تھے، اور صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کے نزدیک بشرط عجز جائز تھے، امام اعظم نے قرأت قرآن کے بارے میں اپنے شاگردوں کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا کیونکہ اس معاملہ میں صاحبین کی دلیل قوی تھی۔

فلقوة دليلهما رجع اليه وأما الشروع بالفارسية فالدليل فيه للامام أقوى۔ [۱]

لیکن جہاں تک بقیہ اذکار و ادعیہ کا تعلق ہے امام صاحب کا رجوع ثابت نہیں ہے:

وقد اثبت العيني في شرح الكنز والطرابلسي في البرهان رجوعه في مسألة التكبير ايضاً وليس ذالك بصحيح۔ [۲]

بلکہ اس کے برعکس صاحب الدر المختار نے پورے زور کے ساتھ لکھا ہے کہ قرأت قرآن کے بارے میں امام صاحب نے صاحبین کے مسلک کی طرف رجوع کیا اور صاحبین نے بقیہ اذکار میں اپنے استاذ گرامی کے مسلک کی طرف رجوع کیا، در المختار میں یہ عبارت صفحہ ۲۱ اور صفحہ ۶۹ پر مندرج ہے علامہ شامی نے بھی اس کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

فظاهره كالمتن رجوعهما اليه لاهوائيهما فاحفظه، فقد شنّع على كثير من القاصرين حتى الشرنبلالي في كتبه فتنبه۔

اس کی تائید فتاوی تاتارخانیہ سے بھی ہوتی ہے علامہ شامی نے اس کی یہ عبارت نقل کی ہے:

وفي شرح الطحاوي ولو كبر بالفارسية او سمى عند الذبح أو لبى عند الاحرام بالفارسية او باى لسان سوا كان يحسن العربية اولا جاز بالاتفاق۔

اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ شامی نے ایک احتمال یہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ تکبیر سے یہاں تکبیر تحریمہ کے بجائے تکبیر تشریق مراد لینا اولیٰ ہے تاکہ بقیہ اذکار مذکورہ کی طرح یہ بھی بیرون نماز کے اذکار میں شامل ہو جائے اور اس طرح بالاتفاق جواز کا قول بیرون نماز کے اذکار کی بابت ہو لیکن علامہ شامی کا یہ احتمال حد درجہ احتیاط کی بنا پر ہے، شارح طحاوی کے مقصد کے موافق نہیں ہے۔

علامہ لکھنوی مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ جو لوگ اذکار نماز کو غیر عربی میں محض اسلئے ناجائز سمجھتے ہوں کہ آسمان سے نازل ہو کر اس کی تعلیم دینے والے فرشتہ کی زبان عربی تھی تو دیگر اذکار کے ساتھ بھی یہ قید ضروری ہو جائے گی، کیونکہ جملہ اذکار و ادعیہ صاحب رسالت و شریعت کی طرف سے عربی ہی زبان میں وارد و صادر ہوئی ہیں:

فالظاهر ان الاذان ايضاً على الخلاف، واما الصحيح انه لا يجزئ بالفارسية وان علم انه اذان۔ فان كان المراد انه لا يجزئ مطلقا وانه يجب اعادته كاعادة الاذان جنبا فلا يظهر وجهه۔ ومن بين ماعداه من اذكار الصلوٰة خصوصية۔ فان كان ذالك لورودة بالعربي بلسان الملك النازل من السماء فعلى ذالك كل الاذكار واردة بالعربية على لسان صاحب الشريعة البيضاء۔

علامہ لکھنوی نے ایک اور حوالہ نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ثابت ہوتا ہے کہ بیرون نماز کے اذکار کو غیر عربی میں ادا کرنا صاحبین کے مسلک کی رو سے جائز ہے۔

وفي جامع المضمرات فان افتتح الصلوٰة بالفارسية، او ذبح وسمى بها وهو يحسن العربية اجزاه عند ابي حنيفة وقالا لا يجزيه الا في الذبيحة، فان لم يحسن العربية اجزاه۔

اس مسئلہ میں بعض علماء جیسے امام غزالی وغیرہ شوافع نے امام اعظمؒ کے مسلک پر طعن کیا ہے کہ امام اعظمؒ نے ادلۂ شرعیہ کو پس پشت ڈال دیا ہے، لیکن یہ طعن و اعتراض صحیح نہیں ہے، فقہاء احناف نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

فان اخذ فيه بظاهر قوله تعالى وذكر اسم ربه فصلى، حيث لم يقيد فيه الذكر بلسان بل ذكر مطلقا وفرع عليه فصلى، ولان المقصود هو التعظيم، ونظيره قوله عليه السلام "امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله" فلو آمن احد بغير العربية جاز اجماعا بين العلماء الاسلامية۔

اس حوالہ میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ ذکر کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی خاص زبان سے مقید نہیں فرمایا بلکہ مطلقاً وارد ہے اور مقصود اس میں زبان نہیں معنی ہے، اس کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ جاری رکھوں تا آنکہ لوگ لا الہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں"، لیکن معلوم ہے کہ علماء کا اتفاق بلکہ اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر عربی الفاظ ادا کئے ایمان لائے تو اس کا ایمان معتبر ہے۔ اس میں کسی کا قول عدم جواز یا جواز مع الکراہت مذکور نہیں ہے۔

اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں دعاؤں کے بارے میں مذکور ہے:

ان المقصود من الادعية انما يكون المعاني دون خصوص المباني، والعربية وغير العربية فيه مستويان في تادية المعاني۔

لیکن اس اطلاق کے ساتھ یہ قید ضروری ہے کہ اس کا مدلول مجہول اور شان خدا کے منافی نہ ہو جبکہ وہ عربی زبان کا علم ہو۔

فهو لاشبهة في حرمة الاعجمية المجهول مدلولها والعجمية التي

تنافی تعظیم الرب تعالی مدلولها، فیکره تحریما فی الصلوٰة وتنزیها خارج الصلوٰة، لکن بشرط ان یکون قادرا علی العربیة قدرة کاملة والا فلا، ولکن یستثنی من الکراهة خارج الصلوٰة من یعتاد التکلم بالفارسیة ویشق علیه التکلم بالعربیة فینبغی ان لا یکره له خارج الصلوٰة الدعاء بالفارسیة ،، [9]

یہاں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اگر عربی زبان پر قادر شخص غیر عربی زبان میں دعا و ذکر کو ادا کرے اور اس کا مدلول مجہول یا منافی شان رب العالمین ہو تو حرام، ورنہ مکروہ تحریمی اندرون نماز اور مکروہ تنزیہی بیرون نماز البتہ عربی کی ادائیگی میں زحمت ومشقت پیش آتی ہو اور فارسی وغیرہ کا عادی ہو تو اس کے حق میں بیرون نماز کے اذکار وادعیہ کی ادائیگی میں کراہت تنزیہیہ بھی نہیں ہے۔

صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی نے بھی امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف کو منقول کرتے ہوئے امام اعظم کے مسلک کی تائید وتصویب کی ہے [10]

بعض مفتیان کرام نے علامہ شامی کے قول " لکن سیاق کراهة الدعاء بالاعجمیة [11] سے بیرون نماز کے اذکار کی کراہت تحریمی پر استدلال کیا ہے، حالانکہ یہ بحث اندرون نماز کے ذکر و دعا کے ذیل میں آئی ہے، ملاحظہ ہو:۔

وتقیید الاعجمیة بالمجهولة المدلول اخذه من تعلیله بجواز استعمالها علی ماینافی جلال الربوبیة ثم قال واحترزنا بذالک عما اذا علم مدلولها فیجوز استعمالها مطلقا فی الصلوٰة وغیرها، لان الله تعالیٰ قال " وعلم آدم الاسماء کلها " "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه " لکن المنقول عندنا الکراهة وظاهر التعلیل ان الدعاء بغیر العربیة خلاف الاولی وان الکراهة فیه تنزیهیه . هذا وقد تقدم اول الفصل ان الامام رجع الی قولهما بعدم جواز الصلوٰة بالقرأة الفارسیة . واما بقیة اذکار الصلوٰة فلم ار من صرح فیها بالکراهة سوی ماتقدم ، [12]

اس بحث کے آخر میں علامہ موصوف نے نہایت محتاط الفاظ میں اپنی یہ رائے بیان کی ہے:

" ولایبعد ان یکون الدعاء بالفارسیة مکروها تحریما فی الصلوٰة و تنزیها خارجها فلیتامل ولیراجع ،،

علامہ موصوف کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ علامہ کو دونوں میں سے کسی ایک پر بھی شرح صدر نہیں ہے یعنی نہ اندرون نماز کے اذکار کی غیر عربی ادائیگی کی کراہت تحریمیہ پر اور نہ بیرون نماز کے اذکار کی غیر عربی ادائیگی کی کراہت تنزیہی پر۔ ایسی صورت میں علامہ کے اس قول سے بیرون نماز کے اذکار پر مکروہ تحریمی کا استدلال عجیب وغریب چیز ہے۔ پیچھے گذر چکا ہے کہ بیرون نماز کے اذکار کی غیر عربی ادائیگی صاحبین کے نزدیک بھی بلا کراہت جائز ہے۔

" وفی جامع المضمرات فان افتتح الصلوٰة بالفارسیة او ذبح وسمی بها وهو یحسن العربیة اجزاه عنده وقالا: لایجزیه الا فی الذبیحة فان لم یحسن العربیة اجزاه ،، [13]

بیرون نماز کے ذکر میں سے ہی خطبۂ جمعہ بھی ہے، امام اعظمؒ کے مسلک کے اعتبار سے خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں مطلقاً جائز ہے، خطیب خواہ عربی زبان پر قادر ہو یا نہ ہو اور صاحبین کے نزدیک بعذر عجز کی قید ہے،

" وفی الهدایة والمجتبی وجامع المضمرات وغیرها ان الخطبة علی الاختلاف یعنی انه یجوز عند ابی حنیفة بغیر العربیة للقادر والعاجز کلیهما، وعندهما للعاجز ،،

امام اعظم کا استدلال اس ارشاد باری تعالیٰ سے ہے:

یا ایها الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر الله، فان المراد بذکر الله هو الخطبة علی ما ذکره اهل التفسیر وهو مطلق غیر مقید بالعربی فیکون کالتکبیر فی انه لایشترط فیه خصوصیة لسان دون لسان " [14]

صاحبین کے اختلاف کی بنیاد یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ خطبۂ جمعہ کو نماز کے مشابہ بلکہ اس کے قائم مقام قرار د

تنافی تعظیم الرب تعالی مدلولھا، فیکرہ تحریما فی الصلوٰۃ وتنزیھا خارج الصلوٰۃ، لکن بشرط ان یکون قادرا علی العربیۃ قدرۃ کاملۃ والا فلا، و لکن یستثنی من الکراھۃ خارج الصلوٰۃ من یعتاد التکلم بالفارسیۃ و یثقل علیہ التکلم بالعربیۃ فینبغی ان لایکرہ لـہ خارج الصلوٰۃ الـدعاء بالفارسیۃ ،، [9]

یہاں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اگر عربی زبان پر قادر شخص غیر عربی زبان میں دعا و ذکر کو ادا کرے اور اس کا مدلول مجہول یا منافی شانِ رب العالمین ہو تو حرام، ورنہ مکروہ تحریمی اندرونِ نماز اور مکروہ تنزیہی بیرونِ نماز۔ البتہ عربی کی ادائگی میں زحمت و مشقت پیش آتی ہو اور فارسی وغیرہ کا عادی ہو تو اس کے حق میں بیرونِ نماز کے اذکار و ادعیہ کی ادائگی میں کراہت تنزیہیہ بھی نہیں ہے۔

صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی رحمہ نے بھی امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف کو منقول کرتے ہوئے امام اعظم کے مسلک کی تائید و تصویب کی ہے [10]

بعض مفتیانِ کرام نے علامہ شامی کے قول "لکن سیاتی کراھۃ الدعاء بالاعجمیۃ [11]" سے بیرونِ نماز کے اذکار کی کراہت تحریمی پر استدلال کیا ہے، حالانکہ یہ بحث اندرونِ نماز کے ذکر و دعا کے ذیل میں آئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

وتقید الاعجمیۃ بالمجھولۃ المدلول اخذہ من تعلیلہ بجواز استعمالھا علی ماینافی جلال الربوبیۃ ثم قال واحترزنا بذالک عما اذا علم مدلولھا فیجوز استعمالھا مطلقا فی الصلوٰۃ وغیرھا، لان اللہ تعالیٰ قال "وعلم آدم الاسماء کلھا" "ومارسلنا من رسول الا بلسان قومہ" لکن المنقول عندنا الکراھۃ وظاھر التعلیل ان الـدعاء بغیر العربیۃ خلاف الاولی وان الکراھۃ فیہ تنزیھیـہ۔ ھذا وقد تقدم اول الفصل ان الامام رجع الی قولھما بعدم جواز الصلوٰۃ بالقراءۃ الفارسیۃ۔ واما بقیۃ اذکار الصلوٰۃ فلم ار من صرح فیھا بالکراھۃ سوی ماتقدم" [12]

اس بحث کے آخر میں علامہ موصوف نے نہایت مختصر الفاظ میں اپنی یہ رائے بیان کی ہے:۔

"ولا یبعد ان یکون الـدعاء بالفارسیۃ مکروھا تحریما فی الصلوٰۃ و تنزیھا خارجھا فلیتامل والـیراجع"

علامہ موصوف کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ علامہ کو دونوں میں سے کسی ایک پر بھی شرح صدر نہیں ہے یعنی نہ اندرونِ نماز کے اذکار کی غیر عربی ادائگی کی کراہت تحریمیہ پر اور نہ بیرونِ نماز اذکار کی غیر عربی ادائگی کی کراہت تنزیہی پر، ایسی صورت میں علامہ کے اس قول سے بیرونِ نماز کے اذکار پر مکروہ تحریمی کا استدلال عجیب و غریب چیز ہے۔ پیچھے گذر چکا ہے کہ بیرونِ نماز کے اذکار کی غیر عربی ادائگی صاحبین کے نزدیک بھی بلاکراہت جائز ہے۔

"وفی جامع المضمرات فان افتتح الصلوٰۃ بالفارسیۃ او ذبح وسمی بھا وھو یحسن العربیۃ اجزاہ عندہ وقالا: لایجزیہ الا فی الـذبیحۃ فان لم یحسن العربیۃ اجزاہ" [13]

بیرونِ نماز کے ذکر میں سے ہی خطبۂ جمعہ بھی ہے، امام اعظم رح کے مسلک کے اعتبار سے خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں مطلقاً جائز ہے، خطیب خواہ عربی زبان پر قادر ہو یا نہ ہو اور صاحبین کے نزدیک بعجز کی قید ہے،

"وفی الھدایۃ والمجتبی وجامع المضمرات وغیرھا ان الخطبۃ علی الاختلاف یعنی انہ یجوز عند ابی حنیفۃ بغیر العربیۃ للقادر والعاجز کلیھما، وعندھما للعاجز"

امام اعظم کا استدلال اس ارشادِ باری تعالیٰ سے ہے:

یا ایھا الـذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ، فان المراد بذکر اللہ ھو الخطبۃ علی ماذکرہ اھل التفسیر وھو مطلق غیر مقید بالعربی فیکون کالتکبیر فی انہ لایشترط فیہ خصوصیۃ لسان دون لسان" [14]

صاحبین کے اختلاف کی بنیاد یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ خطبۂ جمعہ کو نماز کے مشابہ بلکہ اس کے قائم مقام قرار

دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ذکر بھی ان کے نزدیک مثل ذکر فی الصلوٰۃ کے ہے۔

"ان الخطبۃ تشابہ الصلوٰۃ بل کانہا قائمۃ مقام الصلوٰۃ مکان اذکار الصلوٰۃ لا تجوز لغیر العاجز بغیر العربیۃ کذالک الخطبۃ لا تجوز الا بالعربیۃ"

لیکن صاحبین کے مسلک کی یہ نقل اور پھر اس کی یہ وضاحت محل نظر ہے، کیونکہ خطبۂ جمعہ اگرچہ نماز کے مشابہ اور اس کے قائم مقام ہو لیکن اندرون نماز کا ذکر نہیں ہے یعنی نماز کا رکن نہیں ہے بلکہ نماز جمعہ کی شرط ہے علامہ عبدالحی لکھنوی صاحب عمدۃ الرعایۃ فرماتے ہیں:

"وتحقیقہ ان فی الخطبۃ جہتین، الاولی کونہا شرطا لصلوٰۃ الجمعۃ، والثانیۃ کونہا فی نفسہا عبادۃ"

یہ گزر چکا ہے کہ رکن کی دعا کو غیر عربی میں ادا کرنا صاحبین کے مسلک کے اعتبار سے ایسے شخص کیلئے بھی جائز ہے جو عربی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔ اس جزئیہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ بیرون نماز کے اذکار کی بابت صاحبین کا مسلک جواز صریح ہے۔ پھر اس سے بڑھکر روایت صاحب الدر المختار کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ قرأت قرآن کے سوا بقیہ اذکار نماز کے بارے میں صاحبین نے اپنے استاذ گرامی کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا ہے اور یہ اس صورت میں اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ کراہت کی نفی امام اعظم کے مسلک میں بھی نہ سمجھی جائے گی اگرچہ منقول نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء کو اصرار ہے حالانکہ یہ ایک بے دلیل بات ہے، اذکار وادعیہ کا عربی زبان میں مجرد ورود دلیل شافی نہیں ہے جیسا کہ پچھلے صفحات میں وضاحت کی جا چکی ہے بلکہ اس کے لئے دلیل آخر کی احتیاج ہوتی ہے ورنہ نفس ذکر و دعا بھی غیر عربی میں مکروہ تحریمی قرار پائے گی۔

خطبہ جمعہ کی زبان پر غور و فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو عربی میں ادا کرنے پر قادر وہ شخص نہیں قرار پا سکتا جو اچھی طرح کامل طور پر قادر نہ ہو، بلکہ اس کا شمار بجائے "قادر" کے "عاجز" میں ہوگا۔ تمام اقوال و آراء جو ائمہ حنفیہ سے منقول و مروی ہیں ان میں صاف طور پر "یحسن العربیہ" یا "قادر علی العربیۃ قدرۃ کاملۃ" کا اسلوب استعمال کیا گیا ہے جو معمولی عربی دانی پر صادق نہیں آسکتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آجکل کے بہت سے مولوی صاحبان بھی "عاجز" قرار دیئے جائیں گے اگر وہ اٹھا کر یا کتاب

دیکھکر نہ پڑھیں اور یہ عمل طریق سلف کے خلاف ہے۔ اس سے بہتر ہوگا اگر طریق سلف کو اختیار کیا جائے اگرچہ ایک خطبہ یعنی زبان غیر عربی استعمال کرلی جائے مگر اس طور پر کہ اس میں کچھ آیات و احادیث کا التزام کیا جائے کیونکہ بعض نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنا امام ابویوسف کے مسلک کے لحاظ سے خطبہ میں کسی کراہت کا موجب نہ ہوگا:

"لو خطب بالفارسیۃ وھو یحسن العربیۃ لا یجوز عندہ الا ان یکون الذکر فی ذالک بالعربیۃ فی حرف او اکثر"

ان تمام باتوں کے ساتھ اس خاص اصول کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ خطبہ جمعہ جب ذکر ہے تو اس میں اصل معنی ہے نہ کہ لفظ و معنی، کیونکہ دعا و ذکر کی اصل یہی بیان کی گئی ہے:

"ان المقصود من الادعیۃ انما یکون المعانی دون خصوص المبانی والعربیۃ وغیر العربیۃ مستویان فی تادیۃ المعانی"

تو پھر اسکو غیر عربی میں ادا کرنا کیونکر مکروہ تحریمی ہونا چاہئے؟ تاہم علماء کی ایک قابل لحاظ تعداد کی رائے یہی ہے، یا صحیح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ وہ نقل یہی کرتے ہیں۔

جن فتووں میں کراہت تحریمیہ کو نقل کیا جاتا ہے ان میں سوائے اس استدلال کے کہ غیر عربی میں خطبہ دینا عمل سلف یا سنت متوارثہ کے خلاف ہے، کوئی دلیل نہیں ملتی۔ عمدۃ الرعایۃ ج، اول صفحہ ۲۴۲ پر تحریر ہے:

"فانہ لا شک فی ان الخطبۃ بغیر العربیۃ خلاف السنۃ المتوارثۃ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم والصحابۃ رضی اللہ عنہم اجمعین فیکون مکروھا تحریما"

یہی بات حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی، مکمل و مدلل انداز میں امداد الفتاوی جلد اول صفحہ ۲۲۳ پر لکھی ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت خطبہ بالعربیہ پر ظاہر ہے اور اس کی عربی کی مقصودیت حضرت صحابہ کے ممالک عجم میں باوجود بعض صحابہ کے عارف بالفارسیہ ہونے اور باوجود حاجت سامعین، غیر عربی میں نہ پڑھنے سے ثابت ہے، جب یہ عربیت مقصود

بالمواظبہ ہوئی تو اس کی قید کی رعایت سنت مؤکدہ ہوگی اور سنت مؤکدہ کے ترک کو فقہا نے موجب اثم اور بعض جزئیات میں موجب فسق قرار دیا ہے جو دلالت تحریم کے لیے کافی ہے۔"

اس فتویٰ مبارکہ میں ایک اصول شرعی کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس امر پر مواظبت فرمائی ہو اس کی حیثیت سنت مؤکدہ کی ہوگی، البتہ ایک بات کی وضاحت چھوٹ گئی کہ امر مواظب علیہ کے لیے ضروری ہے کہ اسے رسول اللہؐ نے بقصد اقتداء المسلمین وتشریع عام اسے اختیار فرمایا ہو اور اس پر مواظبت فرمائی ہو، ورنہ اس کی حیثیت مباح یا زیادہ سے زیادہ مستحب ومندوب کی ہوگی۔ قانون اسلامی کی حسب ذیل دفعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ کل ما واظب علیہ الرسول علیہ السلام من شؤونہ الدینیۃ ولم یترکہ الا مرۃ او مرتین لیدل علی عدم تحتیمہ ۔ ۔ ۔ ۔ یسمی سنۃ الھدیٰ او السنۃ المؤکدہ"

۲۔ کل ما صدر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اقوال وافعال انما یکون حجۃ علی المسلمین واجبا اتباعہ اذا صدر عنہ بوصف انہ رسول اللہ وکان مقصودا بہ التشریع العام واقتداء المسلمین وذالک لان الرسول علیہ السلام انسان کسائر الانسان اصطفاہ اللہ رسولا الیہم کما قال تعالیٰ "قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی"

۳۔ (الف) ما صدر عنہ بمقتضی طبیعتہ الانسانیۃ من قیام وقعود،
(ب) وما صدر عنہ بمقتضی الخبرۃ الانسانیۃ من تجارۃ وزراعۃ،
(ج) وما صدر عنہ ودل الدلیل الشرعی انہ خاص بہ کتزوجہ باکثر من اربع زوجات۔

فھو کلہ من سنۃ ولکن لیس تشریعا ولا قانونا واجبا اتباعہ" [16]

ان دفعات مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ کسی امر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت اس کے سنت مؤکدہ ہونے کی دلیل نہ قائم ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد اس سے تشریع و اقتدا تھا۔

یہی اصول صحابہ کرام کی سنت، و مواظبت کا بھی ہے۔ البتہ اجماع کی ایک الگ حیثیت ہے۔

اس اصول کے پیش نظر خطبۂ جمعہ کی زبان کا حکم معلوم کرنا چاہیے۔ اس اصول سے متعلق چند اور بنیادی امور کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ کہ کوئی امر مجموعی صورت میں جو حکم و حیثیت رکھتا ہے اس کے تمام اجزاء کی بھی الگ الگ وہی حیثیت نہیں ہوا کرتی جیسے وضو اور نماز ہیں کہ ان کے اجزاء میں کچھ فرض تو کچھ واجب اور کچھ سنت و مستحب۔

۲۔ یہ کہ امر مواظب اگر کلی امر مواظب علیہ کے خصائص میں نہ ہو تو سنت مؤکدہ نہ ہوگا جیسے وضو میں مسواک مواظب علیہ ہے لیکن سنت مؤکدہ نہیں ہے۔

۳۔ یہ کہ بعض امور جن پر کلی مواظبت پائی جاتی ہے لیکن سنت مؤکدہ نہیں ہیں جیسے اعتکاف رمضان یا صلوٰۃ الضحیٰ۔

۴۔ یہ کہ بعض امور جن کو آپ نے ایک بار بھی نہیں انجام دیا ہے تاہم وہ سنت مؤکدہ ہیں جیسے اذان۔

۵۔ یہ کہ بعض امور جن پر مواظبت پائی جاتی ہے لیکن وہ مباح یا مندوب ہیں جیسے تیامن فی الترجل والتنعل واللبس والاسراد۔ "جاری"

[1] شامی ج ۱ ص ۳۲۵، [2] عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایہ ج ۱ ص ۲۶۵، [3] شامی ج ۱ ص ۲۷۲، [4] شامی ج ۱ ص ۳۲۵، [5] آکام النفائس ص ۲۱، [6] ایضاً، [7] الاذکار لعلمان الفارس ص ۵، [8] حوالہ سابق [9] حوالہ سابق [10] شامی ج ۱ ص ۳۲۵، [11] شامی ج ۱ ص ۳۵۰، [12] آکام النفائس ص ۲۱، [13] الاذکار لعلمان الفارس ص ۲۰، [14] حوالہ سابق، [15] آکام النفائس ص ۲۱، [16] علم اصول الفقہ ص ۱۱۲، [17] علم اصول الفقہ ص ۴۴،

مضامین خوشخط اور صفحہ کے ایک ہی طرف لکھ کر روانہ کریں۔
(ادارہ)

ابوالمجاہد زاہد

قرآن مجید

بحمد اللہ! جینے کا نیا ساماں نکل آیا
مٹی تاریکیٔ شب، مہر نو افشاں نکل آیا

چمک اٹھیں جہالت کی نگاہیں علم و عرفاں سے
توہم کے بھیانک غار سے انساں نکل آیا

حرارت ہو گئی پیدا دلوں میں سوز ایقاں سے
حصار کفر کو ڈھاتا ہوا ایماں نکل آیا

ہزاروں رحمتیں لے کر "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْن" آیا
خدا کا آخری پیغام قرآن مبین آیا

محبت مسکرائی، زندگی کا رہنما آیا
اخوت گنگنائی، دور تیغ جور و جفا آیا

عدالت نے کہا میرا نصیبہ جاگ اٹھا ہے
صداقت نے کہا میرا بھی دور رفتہ آیا

غریب انسانیت آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی
خدا کا شکر ہے میرا بھی اک درد آشنا آیا

نسیم صبح امن و عافیت ہر سو پکار آئی
مبارک ہو کہ اب گلشن میں قرآنی بہار آئی

سیاسیات کے جوہر دکھائے جس نے وہ قرآں
معاشیات کے گیسو سنوارے جس نے وہ قرآں

کیا اعلان جس نے اک خدا کی حاکمیت کا
مٹائے سارے انجم ہمالے جس نے وہ قرآں

کہا جس نے نہیں ہے ظلم کوئی شرک سے بڑھ کر
جراثیم وبائے کفر مارے جس نے وہ قرآں

کہا اللہ ہی کو حاکم و فرمانروا مانو
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ لوگو

کہا قرآں نے پوری طرح ہو اسلام میں داخل
کہ ان الدین عند اللہ الاسلام اور سب باطل

جہاں اک رہگزار صدق و اخلاص و محبت ہے
یہی ہے زندگی کا ناخدا اور امن کا ساحل

جو نا اسلام "کو اسلام پر ترجیح دیتے ہیں
وہ نامقبول حق ہیں، وہ ہیں سرگشتۂ منزل

خدا شاہد ہے جب تک ہیں مسلماں حامل قرآں

وہی چلتی انھیں کے پیچھے پیچھے گردش دوراں

اگر قائم ہو قرآنی حکومت کا نظام اب بھی
بدل سکتی ہے صبح امن میں یہ ہول شام اب بھی

اگر ہو جائے پابند ہدایات خداوندی
تو مل سکتا ہے پھر انساں کو اپنا مقام اب بھی

اگر چلنے لگے اللہ کے احکام پر انساں
تو ہو سکتا ہے "روشن زندگی" کا حسن عام اب بھی

مسلمانو! اٹھو قرآن کی دعوت کو پھیلاؤ
جہان بے اماں کو عافیت کے راز سمجھاؤ

فروغ ظلم ہے تو مرد مومن ہی کی عبادت تک
ابھی فتنے ہیں غیر اللہ ہی کی حاکمیت تک

خدا اور آخرت سے بے نیازی ہی تباہی ہے
برائی جاگتی ہے نفس امارہ کی طاعت تک

طلوع صبح روشن تک رہے گا کالی رات کا جادو
معصیت ہے خدا نا آشنا دور قیادت تک

زمانہ آج بھی قرآن ہی سے فیض پائے گا
ہٹے گی ظلمت شب اور سورج جگمگائے گا

ابیات

عطا عابدی

خود نمائی کا جنوں تم کو مبارک لیکن
اپنی چادر سے عطا پاؤں نہ باہر نکلے

سر چھپانے کی کہاں جا ہے ہوس کی بستی
وقت کا طوفان جب آئے گا سب لے لیگا

نقش جو نقش ہے بن جائیگا ورنہ کہیں تحریر عطا
زندہ رہنا ہے تو کچھ لوح قلم سے آگے بھی

دنیائے بے ثبات ہے عیش و طرب نہ ڈھونڈ
حسن عمل سے کام لے نام و نسب نہ ڈھونڈ

کہہ رہا ہے اہل ساحل سے سمندر کا وجود
مجھ میں جو غوطہ لگائیگا گہر لیجائیگا

حضور شیخ کہاں ہے اب ایسا پروانہ
خدا کے نام پہ جو سارا گھر اٹھا لائے

غزل

مجاز نوری

آپ سے آج بھی گفتگو رہ گئی
دل کا ارماں رہ گیا آرزو رہ گئی

کس طرح مجھکو منزل کا ملتا پتہ
راہ امید میں جستجو رہ گئی

میکدہ کی حقیقت وہ باقی نہیں
اک نشان جام و سبو رہ گئی

میرے مدفن کی حسرت کا کیا پوچھنا
خاک اڑتی ہوئی کو بہ کو رہ گئی

نوری اچھا ہوا اشک ٹپکا نہیں
غیر کے سامنے آبرو رہ گئی

اسرار عالم دہلی

نصب العین

(دوسری قسط)

(۱) عصری مناسبت و مطابقت — نصب العین کے تعین میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے کسی عصری مسئلے سے ہو یعنی نصب العین سرے سے Out dated نہ ہو۔ اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ نصب العین میں بذاتہ کتنی خرابت اور ضعبیت پائی جاتی ہو۔

(۲) طاغوت کا تعین — اس زمین پر ابتدائے تاریخ انسانی سے آج تک انسانوں پر ایسا کوئی لمحہ نہیں گزرا جب حق اور باطل کی قوتیں بیک وقت موجود نہ رہی ہوں خواہ ان میں سے کوئی قوت کتنی ہی تھوڑی اور حقیر کیوں نہ رہی ہو۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ اور کوئی تیسری کیفیت اصولی طور پر انسانوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ یا تو حق غالب ہوگا اور باطل مغلوب یا باطل غالب ہوگا اور حق مغلوب اور نہ بیک وقت کسی خطۂ خاص میں حق و باطل دونوں غالب ہوں گے نہ دونوں مغلوب۔ جو حق نہیں وہ باطل ہے جو باطل نہیں وہ حق ہے۔

باطل زندگی کے تمام پہلوؤں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ غالب ہونے کی حالت میں اس کے استحکام کی اور اپنے دشمنوں کی بیخ کنی کی کوشش میں منہمک رہتا ہے۔ باطلانہ زندگی کا وہ پہلو جو کسی مخصوص عہد میں دوسرے پہلوؤں سے زیادہ قوی، حاوی، موثر، ہمہ گیر اور نمایاں ہوتا ہے اسے طاغوت کہتے ہیں۔ قرآن و سنت سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ اس کے اور کچھ نہیں باطلانہ نظام میں اس کو جو کوئی پہلو ابھرا ہوا اور نمایاں ہوتا ہے کسی عہد کا طاغوت وہی ہے خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی پہلو سے ہو۔ یہ پہلو اس قدر ہمہ گیر ہوتا ہے کہ خود باطلانہ زندگی اور اس نظام کا ہر شعبہ اس سے متاثر اور اسی کا خوشہ چیں ہو جاتا ہے۔

نصب العین کے تعین میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ کسی باطلانہ نظام میں اصل

طاغوت کون ہے اس لئے کہ نصب العین کا بلا واسطہ تعلق نظام باطل کے طاغوت سے ہوتا ہے جس کا ذکر عنقریب آرہا ہے۔ اگر طاغوت کا صحیح تعین نہ ہو سکا تو یہ بات بھی مشکل ہو جائے گی کہ اس کی پہچان کی جائے کہ درست نصب العین کیا ہو۔

(۳) نصب العین اور طاغوت کا باہمی تعلق — ایک صحیح جامع اور کامیاب نصب العین کی صحت اور پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ طاغوت وقت پر بلا واسطہ بھرپور، دوٹوک، بے امان کیفر ضرب لگائی جاتی ہے۔ یہ ضرب محض نقصان پہنچانے یا جگانے کے لئے اور قلیل مدت کے لئے اور قلیل قوت سے نہیں لگائی جاتی بلکہ اسے زمین بوس کرنے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ ضرب بلا فصل اس وقت تک جاری رہتی ہے بلکہ شدید تر ہوتی جاتی ہے جب تک باطل کی ساری عمارت زمین بوس نہ ہو جائے اور اس ضرب میں تحریک اسلامی اپنا سارا سرمایہ جھونک دیتی ہے نصب العین اور اس کا لفظ لفظ علانیہ طاغوت وقت سے بغاوت اور اس کے انہدام کا اعلان کر رہا ہوتا ہے جو نصب العین طاغوت کی پہچان نہ کرا سکے، جو طاغوت کے مقابلے میں اپنا محاذ پیش کر سکے جو طاغوت کے لئے ناقابل برداشت نہ ہو جائے جو باطلانہ نظام کے ایوانوں میں صاعقہ کی طرح نہ گرے جو وہاں کے ستونوں کو لرزا نہ دے وہ سرے سے نصب العین ہے ہی نہیں۔ جس نصب العین کے لفظ لفظ سے باطلانہ نظام اور طاغوت سے نفرت کی بو اور اس کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی خبر نہ ملتی ہو وہ نصب العین بانجھ نصب العین ہوا کرتا ہے۔

(۴) نصب العین کے خد و خال — نصب العین کے تعین اور اس کے شرائط کے ذکر کے بعد جو سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر ان باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جو نصب العین مقرر کیا جائے گا اس کی شکل کیا ہوگی اس کے خد و خال کی نمایاں صفات کیا ہوں گی۔

قرآن و سنت کے طویل مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تحریک اسلامی میں نصب العین اگرچہ مختلف زمانوں میں اپنے اپنے حالات سے متاثر ہوتے ہیں مگر ان کی بنیاد یکساں ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل میں مختصراً اس کی کیفیت بتائی جا سکتی ہے۔

(۱) واحد: تحریک اسلامی کا نصب العین ایک عہد میں صرف ایک ہو سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ نصب العین محال ہیں۔

(۲) واضح :- نصب العین صاف، شفاف اور واضح ہو، کوئی بآسانی دیکھ سکے، اس کا تصور کر سکے، اس کے حاصل ہونے پر اطمینان محسوس کر سکے، اس کے نہ ملنے کا اندازہ کر سکے، اس کی نشاندہی کر سکے۔

(۳) نمایاں :- زندگی کے بے شمار معاملات ہیں، اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ زندگی ایک میدان کے مانند ہے جہاں بے شمار راستے گزرتے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی خطِ خاص کے میدان میں تحریک اسلامی کا نصب العین دوسرے تمام لوگوں کے راستوں کے مقابلے میں نمایاں لگے، خواہ اس کی وجہ غرابت ہی کیوں نہ ہو۔

(۴) غیر مبہم :- تحریک اسلامی کا نصب العین اس قدر واضح ہو کہ ہزاروں میں اس کی پہچان ہو سکے۔ کسی دوسرے پر اس کا اور اس پر کسی دوسرے کا شبہ نہ ہو سکے۔ اس کے خد و خال اپنی جگہ اتنے واضح ہوں کہ عام متبعین بھی تمیز کر سکیں حق جانے کہ باطل۔

(۵) حدید :- نصب العین کو تیز دھار کی طرح ہونا چاہئے۔ اول اس کی کاٹ اتنی تیز ہو کہ اس کے ذریعہ خود اس نصب العین سے وابستہ افراد ہی اور اپنے اردگرد کی زندگی میں پہلے سے قائم تعلقات کو محض اس کی روشنی میں جب ضرورت ہو بے دھڑک کاٹ پھینکیں۔ وہ تعلقات خواہ رشتہ ناطوں کے ہوں یا خون اور معاملات کے۔ دوم یہ کہ اس کی کاٹ کو باطل اور اس کا طاغوت اور روز سے محسوس کرے۔ تحریک اسلامی کا نصب العین باطل کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت اور لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ اس کا نشتر طاغوت کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی مثال انتہائی تیز چیز کی ہے جیسے کوئی شخص اپنے متعین کردہ صراط مستقیم پر سینہ کی طرف تانے ہوئے اس محفل میں چلے جہاں لوگ شراب اور رقص و سرود میں مست بے تحاشا ہجوم لئے ہوں۔

(۶) سخت :- تحریک اسلامی کے نصب العین کو اپنی اہمیت کے اعتبار سے سخت اور بے لچک ہونا چاہئے۔ تحریک اسلامی میں یہ وہ چیز ہے جس میں از اول تا آخر نہ کبھی نرمی پیدا ہوتی ہے نہ لچک۔ اور اگر خدا نخواستہ اس میں کبھی بالخصوص ابتدا کے وقت کسی قسم کی نرمی یا لچک کے آثار نمایاں ہو جائیں تو وہ تحریک جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ قرآن و سنت اور تاریخ

اس کی شاہد ہے کہ ایسے افراد کا انجام اچھا نہیں ہوا۔ ایک قدم بغیر آگے بڑھے اپنے نصب العین کو سینے سے لگائے پوری جمعیت کو گنوا دینا اس سے بہتر ہے کہ نصب العین میں نرمی اور لچک پیدا کر کے لاکھوں افراد کو تحریک سے قریب لانا اور متبعین کی جماعت بنا لینا۔

(۷) مکمل :- تحریک اسلامی کے نصب العین کو اپنے ارتقائی حدود میں مکمل ہونا چاہئے اور مرحلہ کا کوئی تدریجی عمل نہیں پایا جانا چاہئے۔ تحریک اسلامی کا نصب العین مرحلہ وار نہیں ہوتا۔ اسلام اپنے ایمان کے لحاظ سے تدریجی نہیں ہے نہ ہی تحریک اسلامی اپنے نصب العین کے لحاظ سے۔

(۸) نصب العین کے اجزائے ترکیبی :- حضرات انبیاء علیہم السلام والتسلیم کے یہاں نصب العین کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ اپنی صفات، اثر آفرینی اور جامعیت کے لحاظ سے اعلیٰ ترین ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ بے مثال و بے نظیر ہیں۔ ان میں کبھی کوئی تضاد واقع نہیں ہوا کبھی ان کی جامعیت مجروح نہیں ہوئی۔

تحریک اسلامی کے نصب العین کے اجزائے ترکیبی سے بحث کرنے سے پہلے یہ بات جان لینی چاہئے کہ ترتیب کے لحاظ سے اسلامی نصب العین ابتداءً منفی پھر مثبت ہوتا۔ اور کبھی بھی اس کی یہ ترتیب معکوس نہیں ہوتی۔ یعنی اسلامی نصب العین پہلے باطل اور طاغوت سے تعارض کرتا ہے پھر حق کی گفتگو کرتا ہے۔ اور اس کا رویہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حق کی گفتگو کرے پھر باطل اور طاغوت سے تعارض کرے یا باطل سے تعارض کئے بغیر حق کی گفتگو شروع کر دے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں نصب العین کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) نصب العین حقیقی اور نصب العین عکسی

نصب العین حقیقی دراصل نصب العین کا وہ رخ ہے جو انہدام باطل و انکسار طاغوت سے بحث کرتا ہے۔ اور اسی کا دوسرا رخ وہ ہے جو اقامت حق اور غلبہ حق سے بحث کرتا ہے۔ یہاں نصب العین عکسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) نصب العین غیر مرئی اور نصب العین مرئی :

نصب العین حقیقی اور نصب العین عکسی کے صرف دو رخ ہوتے ہیں، یعنی نصب العین حقیقی کا غیر مرئی پہلو اور مرئی پہلو۔ اسی طرح نصب العین عکسی کے غیر مرئی اور مرئی پہلو۔

بنیادی طور پر مندرجہ بالا چار عناصر سے نصب العین عبارت ہوتا ہے۔ ان کی ساخت اور ان کی گھٹن نصب العین کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ان میں باہم جس قدر ربط و ارتباط ہوگا جتنی گہرائی و پختگی ہوگی اتنا ہی نصب العین جامع ہوگا۔ مندرجہ بالا عناصر سے بنا ہوا نصب العین کی جامع ترین مثالیں انبیاء علیہم السلام کی تحریکات میں ملتی ہیں۔

(۵) نصب العین کے شعور اس سے وابستگی اور اس کے استحضار کا مفہوم

جب تحریک اسلامی مندرجہ بالا امور کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھتی ہے تو ابتدا ہی سے جو بات سب سے نمایاں معلوم ہوتی ہے وہ اس کا نصب العین ہے۔ اس تحریک سے وابستہ افراد کے ذہن و فکر میں اس نصب العین کا واضح اور گہرا شعور، اس سے بے انتہا وابستگی اور وابستہ لوگوں کی زندگی کے ہر گوشے میں اس کا ذکر اور اس کا استحضار وہ سرمایہ ہے جسے بقیہ ہر چیز پر فوقیت اور اولیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی بات تو ہے کہ فقہ کی فضا سے الگ ہٹ کر جب تحریک اسلامی کے اس دور کا جائزہ لیا جاتا ہے جب پوری ملت اسلامیہ صرف تحریک تھی اور ابھی فقہ کے جامع قانون وجود میں نہیں آئے تھے اس وقت نصب العین سے انسان کا تعلق ہی اسے حق و باطل اور مومن و کافر کے خانے میں تقسیم کرتا تھا۔ اس دور میں صرف دو ہی تحریک ہو سکتی تھی۔ (۱) درون تحریک (۲) بیرون تحریک

درون تحریک جو افراد اور اشخاص نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی اور اسکا استحضار رکھتے تھے اور ان میں خلوص و للہیت پائی جاتی تھی وہی مومن مخلص ہوتے تھے۔ برخلاف وہ افراد و اشخاص جو کسی مجبوری یا مفاد کے تحت اگرچہ نصب العین کے شعور اس سے وابستگی اور اسکے استحضار کا زبانی دعویٰ تو کرتے مگر جن کے قلوب خلوص و للہیت سے عاری ہوتے وہی منافق ہوا کرتے تھے۔

بیرون تحریک جو افراد و اشخاص نصب العین کا شعور رکھتے ہوئے اس سے وابستگی رکھتے ذہن و فکر میں اس کا استحضار ہوتا ہی ان کے قلوب خلوص و للہیت سے عاری ہوتے تو ایسے ہی لوگ منافق ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح بیرون تحریک کے وہ افراد و اشخاص جو قولی یا عملی طور پر اس نصب العین کا انکار کرتے یا اسے قبول کرنے سے انکار کرتے وہی کافر ہوا کرتے۔ اور وہ افراد و اشخاص جو تحریک اسلامی کے نصب العین

(بقیہ ص ۵۳ پر)

طارق نار عابد فلاحی

بنگلور میں ۱۲ دن

SIO کی پہلی کل ہند کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال

پریس گیلری میں بیٹھے ہوئے نامہ نگار دھیرے دھیرے ڈائس کی طرف کھسکنے لگے۔ صرف تین آدمی بچ گئے تھے، میں نے اپنی شیروانی کو بچانے کے لئے میز پوش اوڑھ لیا۔ ہمارے ایک اور ساتھی نے جن کا سوئٹر واٹر پروف تھا سر پر رومال رکھ لیا۔ اور تیسرا میز کے نیچے جا چھپا۔ آڈیٹوریم ۶۰،۷۰ ہزار انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سمپوزیم اپنے شباب پر تھا۔ "ہمارے خوابوں کا ہندوستان" بڑا دلچسپ موضوع تھا۔ انگریزی زبان کے باوجود سامعین لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سید شہاب الدین کی تقریر بڑی دلچسپ تھی۔ جگہ جگہ اشعار نگینوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ ع

نہ کوئی خواب نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار — یہ آدمی تو ادھورا دکھائی دیتا ہے

مگر جب سید شہاب الدین کے خوابوں کا ہندوستان سامنے آیا تو سامعین پہلو بدلنے لگے۔ "ایک ایسا ہندوستان جو نہ مسلم ہو، نہ ہندو ہو اور نہ برہمن بلکہ جہاں آزادی ہو، مساوات ہو، انصاف ہو، غریبوں اور کمزوروں کی ہمدردی ہو، جمہوریت ہو۔" اکھل بھارتی ودیارتھی پریشد کے نمائندے نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اپنے خوابوں کا ہندوستان پیش کیا۔ "ایسا ہندوستان جہاں ہر ایک اپنے ملک کے لئے کام کرے۔ زبان، علاقہ، مذہب اور اپنے مفاد کے لئے نہیں۔ سخت کوشی ہو۔" پھر SIO کے نمائندے محمد نصیر نے اپنے خوابوں کا ہندوستان پیش کیا تو مجمع کو گویا گوہر مقصود مل گیا ہو۔ "اسلامی ہندوستان" کیونکہ اسی کے ذریعہ آزادی، انصاف اور مساوات مل سکتی ہے۔

بارش بہت دیر سے ہو رہی تھی آڈیٹوریم میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ بھیگ رہے تھے مگر کمال صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ قیام گاہوں میں سامان اور بستر بھیگ رہے تھے۔ اور کھانے کی دیگیں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ ایک وقت ایسا آیا جب لوگ اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور پنڈال کو اپنے سروں پر اٹھا لیا اور رب العزت سے دعا کرنے لگے۔ مولانا عبدالعزیز صاحب کی پرسوز دعا نے تمام لوگوں

کے بیر جادیئے پھر پروگرام صبح تک ملتوی کر دیا گیا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی، کبھی تیز اور کبھی آہستہ، نہ بیٹھنے کی جگہ، نہ نماز پڑھنے کی جگہ، نہ کھانے کی جگہ، سب کچھ بھیگ۔ بالفاظ دیگر تمام لوگ بھیگ رہے تھے۔ ۵۰ ہزار کے مجمع کو میدان سے اٹھا کر کہیں منتقل کرنا آسان نہیں تھا، لیکن کوئی بھاگنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ زبان پر اُف، آہ، اور شکوہ و شکایت کے کلمات نہیں، کبھی دعا، کبھی نعرہ تکبیر، اور کبھی کلمۂ شہادت۔ یہی ہر ایک کا سرمایہ۔ صبر و ضبط، ثبات و استقلال ہر ایک کا وطیرہ۔ پروگرام کا التوا ہر ایک کے لئے سوہانِ روح۔ اجتماع کی کامیابی کے لئے ہر ایک دست بدعا۔ رات ایک بجے بارش کچھ کم ہوئی تو عورتوں کو شہر میں جماعت اسلامی کے رفقاء کے گھروں پر منتقل کیا گیا، اور کچھ لوگوں کو بسوں اور لاریوں کے ذریعہ شہر کی مساجد و مدرسوں میں منتقل کیا گیا اور کچھ لوگ جو اپنی ریزرو بسوں میں آئے تھے، بسوں میں جا بیٹھے۔

میں نے شیروانی سے چھتری کا کام لیا۔ دوائی پہلے ہی بھیگ چکی تھی، کہیں بھی شرابور ہو گیا، اور بیڈنگ پانی پر تیرنے لگی۔ صدر حلقہ یوپی منور حسین، لکھنؤ ڈویژن کے انچارج محمد احمد، برادر انعام اللہ اور خاکسار، رات بھر سامان کی حفاظت کرتے رہے۔ والنٹیروں نے سب سے زیادہ جرأت و ہمت اور استقلال کا مظاہرہ کیا، وہ پورے کیمپ کی نگرانی کرتے رہے اور بھیگتے رہے۔

میں نے ایک بار پورے کیمپ کا چکر لگایا تو چند ایسے مناظر سامنے آئے جن کو کسی کیمرے نے محفوظ نہیں کیا۔ جماعت اسلامی کرناٹک عموماً اور جماعت اسلامی بنگلور خصوصاً نے اپنی تمام توانائیاں لگا دیں اور اکثر رفقاء پوری رات جاگتے رہے اور شرکاء اجتماع کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ SIO سے محبت اور ہمدردی کی ایک لہر نے پورے شہر بنگلور کو اپنی گرفت میں لے لیا، ہر ایک نے ان کے صبر و ضبط، ہمت و استقلال کی تعریف کی اور مسجدوں کے دروازے، اسکولوں کے کمرے، گھروں کے پھاٹک کھول دیئے گئے۔ SIO کے کارکنوں نے اور ذمہ داروں نے قابل تقلید مثال قائم کی اور پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام توانائیاں نچوڑ دیں۔

ایک بھی ناخوشگوار اور نامناسب واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ ۲۷، ۲۸ دسمبر شب کی بات ہے۔ الحمد للہ ۲۸ کے پروگرام کے سلسلے میں ایک غیر یقینی کیفیت پیدا ہو گئی، لیکن جیسے ہی سحر طلوع ہوئی اور افق مشرق سے سورج کا سرخ و سپید گولہ نمودار ہوا لوگوں کے چہرے کھل اٹھے اور پھر ڈیڑھ گھنٹہ

کے وقفے کے بعد پروگرام اپنی آن بان سے شروع ہو گیا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث صاحب، قائم مقام امیر جماعت مولانا سراج الحسن صاحب، عزیز سیٹھ، ابراہیم خلیل اللہ، اسماعیل تابش، سید شہاب الدین وغیرہ نے دل جا کیا وہ پیش کی۔

۲۸ دسمبر کو تعلیمی سیشن، ملی سیشن اور اختتامی سیشن کے پروگرام ہوئے۔ تعلیمی سیشن میں علماء اور سماج پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ملی سیشن میں "موجودہ ملی مسئلہ" کے عنوان پر ابراہیم خلیل اللہ، مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اسماعیل تابش، ملت کا اتحاد عزیز سیٹھ، دستور ہند اور ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر طاہر محمود بڑے دلچسپ پروگرام رہے۔ اختتامی سیشن میں یہ بات بیان فرمائی کہ "امن ایک ایسا نعرہ ہے جس کے پیچھے سازش اور اسلحوں کی دوڑ اور جنگوں کی تیاریاں جاری رہتی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں حقیقی امن قائم ہو اور حقیقی امن صرف اسلام کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے۔ طلبہ اور نوجوان انسانی برادری کا سب سے فعال عنصر ہیں ان کو امن کے قیام کے لئے آگے بڑھنا چاہئے۔" طاہر محمود نے فرمایا "یہ بات غلط ہے کہ اسلام باہر سے ہندوستان آیا ہے۔ دنیا کی ۵۵٪ آبادی جن مذاہب کو مانتی ہے ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آدمؑ ہندوستان میں آئے۔ اور اسلام کے بانی حضرت آدمؑ ہی ہیں۔ اس طرح اسلام ہندوستان کا سب سے اولین مذہب ہے۔" مولانا محمود خان صاحب نے فرمایا "کمیونزم کے ناکام ہونے کے بعد انسانیت کی جھولی میں کوئی اور نسخہ نہیں ہے۔ اب صرف اسلام ہے جو مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ سنہ ۸۹ء میں ۵۰ ہزار لوگ اسلام میں داخل ہوئے ماحول آپ کے لئے سازگار ہے، آپ اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیں۔" مولانا عبد العزیز صاحب نے فرمایا "آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ نے اپنی باگ ڈور خدا اور رسول کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ آپ تحریک اسلامی کے بازو اور دست راست ہیں۔ میدان عمل آپ کو پکار رہا ہے، ہر میدان میں کارہائے نمایاں ہی آپ کے شایان شان ہو سکتا ہے۔" اس کے علاوہ سنگاپور کے ایڈیٹر ابراہیم سعید یوسف، سلام سنت، نوشاد نعیم میاں، سید احمد شریف، ڈاکٹر ہوگا، محمد ابراہیم کنیا نے خطاب کیا۔

پروگرام برادر عبد القادر کی تلاوت قرآن سے شروع ہوا اور SIO کے سرپرست اعلیٰ مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی نے خطبۂ افتتاحیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا "اس موقع پر میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے اس فضل و کرم کا بھی شکر ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ

ہیں۔ میں تنظیم کانفرنس میں شرکت اور اس کی افتتاح کی سعادت حاصل کر سکوں، ورنہ پچھلے چند ماہ سے اپنے بعض شخصی حالات بالخصوص اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر اس کانفرنس میں مجھے اپنی شرکت بہت کچھ مشتبہ معلوم ہو رہی تھی۔ درآں حالیکہ یہ عدم شرکت میرے لئے ایک بڑی بدقسمتی کی بات ہوتی کیونکہ اس کانفرنس میں شرکت کو میں اپنے لئے ایک عظیم سعادت سمجھتا رہا ہوں اور عمر کے جس مرحلہ میں میں داخل ہو چکا ہوں اس میں اپنے عزیز طلبہ کی صحبت اور معیت میں جو راحت و سکون مجھے میسر آتا ہے اس کا مجھے کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ میری بہت سی تمنائیں اور امیدیں اس وقت طلبہ اور نوجوانوں ہی سے وابستہ ہیں اور میرے شیریں خوابوں کا مرکز بھی زیادہ تر یہی لوگ ہیں۔ (جب مولانا اس مقام پر پہنچے تو فرطِ جذبات سے ان پر ایک گونہ رقت طاری ہو گئی اور آواز رندھ گئی۔)

حضرات! ایس۔ آئی۔ او۔ جس کے زیرِ اہتمام یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، اسلام پسند طلبہ اور نوجوانوں کی ایک مخصوص نوعیت کی تنظیم ہے جس کا قیام ابھی چند سال پہلے ۱۹۸۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس قلیل مدت میں اس تنظیم نے اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کی تفصیل ان شاء اللہ ابھی تھوڑی دیر بعد اس کے جنرل سکریٹری۔ عزیزی جاوید علی صاحب کی زبانی سن سکیں گے میں اس موقع پر صرف یہ کہنے پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں کہ ان دو تین سالوں میں ایس۔ آئی۔ او۔ نے اپنے محدود وسائل و ذرائع اور ہر طرح کی مشکلات و موانع کے باوجود ملک و ملت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کی دل سے قدر کی جائے۔ میں اس تنظیم کے سرپرستِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے ان کی قابلِ قدر کوششوں اور ان کوششوں کے عمدہ نتائج پر خلوصِ دل سے انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنے فضلِ خاص سے ان کو ہماری توقع سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ملک اور دین و ملت کی خدمت کی یہ توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کے بہترین اجر و صلہ سے سرفراز فرمائے اور انہیں مزید خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

ان طلبہ کی سرگرمیوں کا تھوڑا بہت اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس قلیل مدت میں (۳۰۹۸) طلبہ و نوجوان اس تنظیم کے باقاعدہ ممبر بن چکے ہیں۔ ان کے [illegible] کی تعداد ۱۹۸۲ء [illegible] چلڈرن سرکل کی تعداد ۷۵ ہو چکی ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کی ۱۰۷ شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور بحمد اللہ ان سب کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ

ایک خوش آئند حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر اس عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد کا ان کا فیصلہ اور جیسا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں اپنے اس فیصلے کو کمال و خوبی و سلیقہ کے ساتھ زیرِ عمل لانے کے لئے ان کی یہ کوشش، وہ ان میں تا ہنوز جہاں تک ان کی کامیابی بجائے خود ان کے عزم، ہمت اور ان کی قوتِ کار اور جوشِ عمل ہی کا ایک خوشنما اور نہایت امید افزا مظہر ہے اور جسے دیکھتے ہوئے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں تنظیم اور ہر طرح کے شر و آفت سے محفوظ رکھے اور کانفرنس کے آئندہ تمام مراحل کو بحسن و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

آپ نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا، آپ میں سے تو بیشتر حضرات غالباً اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ یوں تو جماعتِ اسلامی ملک کے تمام باشندوں اور اس کے ہر طبقے و گروہ کو بغیر کسی فرق و امتیاز کے اپنا مخاطب سمجھتی ہے اور ان تک اپنی دعوت پہنچانے کے لئے پوری طرح کوشاں ہے لیکن اس نے اول روز ہی سے طلبہ و طالبات کی تربیت کو خصوصی اہمیت دی ہے، چنانچہ مختلف ریاستوں میں مختلف ناموں سے ان کی ریاستی سطح کی متعدد تنظیمیں بہت پہلے سے جماعت کی سرپرستی میں کام کرتی رہی ہیں لیکن چند سال قبل خود طلبہ کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا ہے کہ ان کی آل انڈیا بنیاد پر کوئی تنظیم قائم ہونی چاہئے۔ ان کی خواہش مختلف وجوہ سے خود ہمیں بھی پسندیدہ نظر آئی کیونکہ الگ الگ تنظیموں کے تحت کام کرنے کے مقابلہ میں کسی آل انڈیا تنظیم کے ذریعہ ان کے کاموں میں ربط و ہم آہنگی پیدا ہونے اور ان کی کارکردگی اور سرگرمیوں میں ترقی و اضافہ ہونے کی کچھ زیادہ ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کی کسی آل انڈیا تنظیم کے تصور کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی ہمیں خاصا اہم نظر آیا کہ اس تنظیم میں طلبہ کو بالکلیہ ایک آزادانہ حیثیت دے دینا کہاں تک مفید ہو سکتا ہے، کیونکہ دین کا کام انجام دینا بجائے خود ایک نازک ذمہ داری ہے اور ملک کے اس وقت کے پیچیدہ اور نازک حالات میں اسے انجام دینے کے لئے ظاہر ہے صرف جوش اور ولولۂ کار ہی کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ساتھ دین کا کام کرنے والوں کو ملک کے حالات کے نشیب و فراز اور ان کے مختلف تقاضوں وغیرہ کو بھی پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے جس کی کما حقہ توقع خام اور ناتجربہ کار طلبہ اور نوجوانوں سے بہرحال نہیں کی جا سکتی تھی لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اس نزاکت کا احساس ہماری ہی طرح خود ان نوجوانوں کو بھی ہوا تھا اور یہ ایک گونہ ان کی سلامتیٔ طبع

ضرورت سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ جنہیں یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جسکے نفاذ کی کوششیں بڑی حد تک خود حکومت ہی کی سرپرستی میں شروع ہو چکی ہیں اور جسکو اگرچہ فی الحال مصلحتاً اختیاری قرار دیئے جانے ہی کا اعلان کیا جا رہا ہے لیکن فی الواقع اسے بتدریج لازمی قرار دیئے جانے کا قطعی منصوبہ بنایا جا چکا ہے درآں حالیکہ اس کا دستور ہند سے ان دفعات سے تضاد ہے جنہیں ملک کی مذہبی و تہذیبی اقلیتوں کو اپنے مذہب اور تہذیب کی بقا و تحفظ کی واضح ضمانتیں دی گئی ہیں، ایک نہایت واضح حقیقت کی نوعیت رکھتا ہے۔ ودان سرگرمیوں کو قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کے ایک ذریعہ کے رنگ و روپ میں پیش کرنا بھی یا تو کھلی عیاری ہے یا انتہائی سادہ لوحی جس کے ثبوت کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں میں یکساں سول کوڈ کے داعیوں کے مابین جو واقعات پیش آ رہے ہیں وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اس موضوع پر بھی نشر واشاعت کی تدبیر حاصل بحثیں آپ مقررہ وقت پر سن سکیں گے۔

خطبہ صدارت صدر تنظیم برادر اشتیاق احمد صاحب نے پیش کیا "جوانی زندگی کا وہ قیمتی زمانہ ہے جب انسان کے قویٰ مضبوط، عزائم بلند، دل جوش و جذبہ سے معمور اور کچھ کر گزرنے کی آرزو و طلب انسان کے اندر ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان ہر طرح کی مصلحتوں و اندیشوں سے بے نیاز اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے راہ کے تمام مصائب و مشکلات کو انگیز کرنے کے لئے آمادہ و تیار رہتا ہے یہی وہ دور ہوتا ہے جس میں انسان حصول علم و اکتساب فن کرتا ہے اور اپنی زندگی کے لئے کسی راہ کا تعین کرتا ہے۔

نوجوانوں کی انہی خصوصیات کی بنا پر ہر فکری تحریک ان کو بطور خاص اپنا مخاطب بناتی ہے۔ تاریخ انسانی کا مطالعہ یہ حقیقت ہم پر واضح کرتا ہے کہ ہر دور میں نوجوانوں نے اپنے دور کی تحریکات میں بھرپور حصہ لیا ہے اور ان کے مقاصد کے حصول کے لئے ہر طرح کی قربانیاں پیش کی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کی نوجوان نسل ان خصوصیات سے عاری ہے؟ اور کیا آج ان کے جوش و عمل کو بناؤ اور تعمیر کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا؟ جواب اثبات میں ہے، لیکن آج ہماری نوجوان نسل زندگی کے حقیقی نصب العین سے محروم ہے جہالت و لاعلمی کا شکار ہے، اخلاقی بحران میں مبتلا ہے، تشدد پسندی اور تخریب کاری کا

عنصر نمایاں ہے اور وہ ایک غلط رُخ پر غلط منزل کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں اس کی اپنی غلطی کم، معاشرہ، حکومت اور سیاسی کرتب بازوں کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ ایس آئی او اسی لئے وجود میں آئی ہے کہ وہ نوجوان نسل کی حقیقی نصب العین کی طرف رہنمائی کرے جہالت اور لاعلمی کو دور کرنے کی کوشش کرے، ان کو اخلاقی بحران سے نکال کر بلند کردار کا نمونہ بنائے، تشدد اور تخریب کاری کے بجائے پیار، محبت، امن، آشتی، تعمیر و ترقی کے کاموں پر لگائے۔"

آج دنیا جنگ کے شعلوں میں گھری ہوئی ہے ایس آئی او اسلام کے امن، ترقی اور نجات کے واضح، اور صاف ستھرے راستے کی طرف بلا رہی ہے۔

اس کے بعد جنرل سکریٹری برادر جاوید علی نے تین سالہ رپورٹ پیش کی۔ یکم محرم الحرام ۱۴۰۳ھ (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۲ء) وہ تاریخ ہے جب ملک کے مختلف صوبوں میں کام کرنے والی طلبہ و نوجوانوں کی تنظیموں کے نمائندوں کے ذریعہ تیار کردہ کل ہند تنظیم کا دستور نافذ العمل ہوا۔ ابتدائی تیاریوں کے بعد یکم اگست ۱۹۸۳ء کو میقات اول (دو سال) کے لئے صدر تنظیم کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور اس طرح اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (ایس آئی او) اپنے دستور کے مطابق وجود میں آگئی۔

اس وقت گیارہ ایسے حلقے ہیں جہاں باقاعدہ منتظم حلقے قائم ہیں۔ صدر حلقہ اور مشاورتی کونسلیں ہیں۔ ان کے نام مع علاقے اس طرح ہیں:-

آندھرا پردیش، بہار، گجرات، کرناٹک، کیرلا، مہاراشٹرا، مدھیہ پردیش، راجستھان، تامل ناڈو، اتر پردیش بشمول دہلی، مغربی بنگال۔

تین حلقے ایسے ہیں جہاں زونل آرگنائزر ہیں، حلقہ کی مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔ اڑیسہ، پنجاب بشمول ہریانہ، ہماچل پردیش، آسام بشمول دیگر شمال مشرقی علاقے۔ اس وقت ملک کی ۹ ریاستوں میں یونٹوں کے ۷۷ حلقے قائم ہیں، ممبران کی کل تعداد ۳۰۹۸، امیدواران ممبری ۴۴۹۶، ایسوسی ایٹس ۱۵۹۲، ہمدرد ۳۴۵، یونٹس ۳۶۳، سرکلس ۷۱۱، طلباء سرکل ۳۵، ممبران، امیدواران ممبری اور ایسوسی ایٹس میں طلباء اور نوجوانوں کا تناسب بالترتیب ہے

ڈی: ۶۵٪ – ۳۰٪ – ۱۴٪ – ۵۵٪ – ۴۵٪ –

اس کے علاوہ اسلامیہ گرلس کالج منصورہ ہاسٹل اور چلڈرن سرکل کے لڑکوں نے بہترین اور کامیاب کلچرل پروگرام پیش کیے، دنیائے اسلام کے بہترین شاعر اور غزل گو جناب حفیظ میرٹھی کی صدارت میں ایک کامیاب مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں تحریک اسلامی کی نمائندہ شخصیات اور ہزاروں سامعین نے ان کی کوششوں کو سراہا اور خراج عقیدت پیش کیا ان کی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ متاع آخر شب کا اجرا امیر جماعت جناب افضل حسین صاحب نے انجام دیا۔ ادارہ ادب اسلامی کے صدر جناب ڈاکٹر احمد سجاد نے حفیظ میرٹھی کے فن پاروں پر روشنی ڈالی۔ اور ان کو بہترین اور کامیاب غزل گو شاعر گردانا۔

S.I.O نے سائنس، اسلام اور مشاہدہ پر مشتمل ایک بہترین نمائش کا اہتمام کیا تھا جس کا افتتاح سید مجتبیٰ حسین کرمانی نے کیا اور جو اپنے مخطوطات، پینٹنگ، چارٹ اور میٹریل کے لحاظ سے کامیاب نمائش تھی، اس کا نام ایکسپو : ۹۰ تھا۔

اس طرح یہ کانفرنس عزم و حوصلہ، جرأت و ہمت، اخوت و محبت، کامیابی و کامرانی کی ایک سنگ میل ثابت ہوئی جس کے لیے S.I.O کے نوجوان بہرحال مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

زبان و بیان میں غیر شعوری طور پر کہیں کہیں جنوب کی جھلک نمایاں ہے۔ (بقیہ تعارف و تبصرہ)

ندائے فضلاء (دو ماہی) ایڈیٹر جمیل احمد نذیری، معاون احمد راشد مبارکپوری فضلاء دیوبند

پتہ: ماہنامہ دو ماہی "ندائے فضلاء" مبارکپور، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۴۰۴

مبارکپور کی سرزمین سے شائع ہونے والا یہ ایک دینی، علمی دو ماہی مجلہ ہے۔ ندائے فضلاء مبارکپور کا ترجمان ہے۔ اور اپنے دامن میں سنجیدہ اور معلوماتی مضامین سمیٹے ہوئے ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ، ندائے اولیں، یوم جنگ نہیں، تدوین حدیث، تاریخی شواہد و حقائق، زبان کی ہلاکت خیزیاں، طلاق اس دور جدید کی خبر، ماہ ربیع الاول، خودکشی، رسول اللہ کی ولادت وغیرہ مضامین پر مشتمل ہے اور لائق مطالعہ ہے اس کو پڑھنا اور پڑھانا اور عام کرنا دین کی خدمت ہے۔

سالانہ زر تعاون ۲۵ روپیہ

کارروائی اجلاس عام برائے بابری مسجد

تمام جمہوری اور سماجی اقدامات کی ناکامی کے بعد

اجودھیا میں نماز جمعہ کی ادائیگی کا عزم

۲۱، ۲۲ دسمبر نئی دہلی۔ کل ہند بابری مسجد کانفرنس کے دو روزہ اجتماعات کے اختتام کے بعد جامع مسجد چوک میں ایک جلسہ عام ہوا جس کی صدارت جناب مولانا سید احمد ہاشمی صاحب سابق ایم۔ پی و صدر بابری مسجد ایکشن کمیٹی دہلی نے کی جلسہ کی کارروائی جناب مولانا نواب الدین صاحب کی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی۔ اس جلسہ عام کے جوش و خروش کا اس امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کڑاکے کی سردی کے باوجود ہزاروں فرزندان توحید ۱۲ بجے رات تک بابری مسجد کی واگذاری کی جدوجہد، کانفرنس کی تجاویز اور مستقبل کے پروگرام کو سننے کے لیے جمے رہے۔

جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب ایم۔ پی نے اجودھیا مارچ اور نماز جمعہ کی ادائیگی کے پروگرام پر زور دیا، اور بابری مسجد کو عملاً مندر میں تبدیل کرنے کے فیصلہ کو ملک کی اتحاد و سالمیت اور جمہوری ڈھانچے کے خاتمہ وغیرہ کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا اور مسلمانوں کو صبر و ضبط اور عزم و حوصلہ کے ساتھ قربانی دینے، اور قید و بند کے ساتھ ہی جان تک کی قربانی کیلئے تیار رہنے کی تلقین کی۔

جناب مظفر حسین صاحب کچھوچھوی سابق ایم پی نے اپنی موثر و ولولہ انگیز تقریر، انقلابی نظم کے ذریعہ مسلمانوں کو قربانی کے لئے آمادہ کرنے کی سعی کی۔ ان کے علاوہ دیگر مقررین نے بھی مجمع کو مخاطب کیا اور کانفرنس کی مختلف تجاویز اور عملی اقدامات سے روشناس کراتے ہوئے وقت، مال اور ضرورت پڑنے پر قید و بند اور جان کی قربانی دینے کی تلقین کی نیز بابری مسجد کے مسئلہ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے روایتی مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کی فضا کو ختم کرنے کی ایک سازش قرار دیا اور اس کا واضح

۱۰ دسمبر کو دانی ایم ہی اے گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان اجتماع کو پرسنل لا بورڈ کے ارکان اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما نے خطاب کیا۔ مقررین نے یکساں سول کوڈ کو ہر شکل و ہر صورت میں ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی کوشش نہ کرے۔ علاوہ ازیں اس عزم کا اظہار بھی کیا گیا کہ ہمارے بزرگوں نے اس ملک میں جو عظیم الشان تاریخ بنائی ہے اس کے اوراق کو بوسیدہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔

۱۱ دسمبر کو ہی دوپہر میں مولانا علی میاں نے ہوٹل ویسٹ اینڈ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم آنجہانی مسز گاندھی کے نام اپنے ایک خط کا تذکرہ کیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تاریخ سوئے ہوئے شیر سے زیادہ   ہوا کرتی ہے، سوئی ہوئی تاریخ کو جگانا نہیں چاہئے۔ آپ نے اس امر پر افسوس کیا کہ جو طاقت اتحاد اور ملکی سالمیت کو یقینی بنانے پر صرف ہونی چاہئے وہ غیر ضروری امور میں ضائع ہو رہی ہے۔

بورڈ کے آخری اجلاس میں منظور کی جانے والی ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھائے اور نہ مسلمانوں پر یکساں سول کوڈ اختیاری یا غیر اختیاری مسلط کرنے کی کوشش کرے۔

مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی صاحب کو دوبارہ آئندہ تین سال کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔ تجویز رحیم قریشی نے پیش کی، و تائید پورے ایوان نے کی۔

یکساں سول کوڈ کسی حال میں منظور نہیں

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کی قرارداد

بمبئی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے حالیہ تاریخی اجلاس بمبئی میں پورے عزم و جرأت کے ساتھ یکساں سول کوڈ سے متعلق فیصلہ کرتے ہوئے یکساں سول کوڈ کو مسترد کر دیا خواہ وہ اختیاری ہو یا لازمی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی بمبئی کے اجلاس کی پاس کردہ تجویز حسب ذیل ہے:

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاس ملک میں یونیفارم سول کوڈ کی تیاری اور نفاذ کی کوششوں

کو گہری تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے شدید اضطراب کا اظہار کرتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کسی بھی صورت میں قابل قبول اور لائق برداشت نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی یا اس کی تنسیخ کی کوششوں کو ناکام کرنے کے لئے مسلمان ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔

بورڈ کا یہ اجلاس مجلس عاملہ منعقدہ ۴-۵ نومبر ۱۹۸۲ء کی قرارداد کی توثیق کرتے ہوئے اس بات کو دہرانا چاہتا ہے کہ ہندوستان جیسے چند مذہبی اور چند تہذیبی ملک میں قومی اتحاد کے نام پر مذہبی تشخص کی امتیازات اور تہذیبی تشخص کو مٹانے کی کوئی بھی کوشش انتشار اور بحران پیدا کرے گی جس سے قومی یکجہتی کے جذبات پیدا ہونے کے بجائے ایسی فضا پیدا ہوگی جس سے ملک کی قوت اور سالمیت کو نقصان پہنچے گا۔ یونیفارم سول کوڈ کو اختیاری کہہ کر اس کے نفاذ کے لئے فضا ہموار کرنے کی کوشش دراصل اپنے کو دھوکے اور فریب میں مبتلا رکھنے کی سازش ہے کیونکہ ایک طرف تو متوازی اور بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو ختم کیا جا سکے گا اور دوسری طرف یہ خدشہ ہے کہ ایک وقفہ کے بعد ایسا کوڈ لازمی نافذ کر دیا جائے گا۔

یہ اجلاس حکومت ہند کو یونیفارم سول کوڈ کی تدوین و نفاذ کے کسی بھی اقدام سے باز رکھنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ بورڈ کا ایک نمائندہ وفد وزیر اعظم ہند سے جلد از جلد ملاقات کرے اور انھیں مسلمانوں کے احساسات سے واقف کرائے اور یہ مطالبہ کرے کہ دستور کی دفعہ ۴۴ میں ترمیم کے ذریعہ یونیفارم سول کوڈ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

یہ اجلاس یہ بھی طے کرتا ہے کہ وزیر اعظم سے گفتگو کی روشنی میں مجلس عاملہ آئندہ اقدامات پر غور کرے اور ضرورت محسوس ہو تو یونیفارم سول کوڈ کے خلاف ملک گیر تحریک منظم کرے۔ اور اس غرض کے لئے ازسرنو مرکزی و ریاستی ایکشن کمیٹیوں کو متحرک کرے۔

یہ اجلاس ایسی تحریک منظم کرنے کے لئے ایکشن کمیٹیوں میں تبدیلی و ترمیم کا کامل اختیار جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو دیتا ہے۔ یونیفارم سول کوڈ سے مسلمانوں کے استثناء کے لئے جد و جہد و تحریک کے خطوط کار متعین کرنے کا مجلس عاملہ کو مجاز گردانتا ہے۔

(بقیہ نصب العین)

کے برعکس کوئی اور نصب العین قولی یا عملی، شعوری یا غیر شعوری طور پر رکھتے ساتھ ہی ساتھ وہ قولی یا عملی شعوری و غیر شعوری طور پر تحریک اسلامی کے نصب العین کو منہدم کرنا چاہتے یا اپنے نصب العین سماوی نصب العین پر غالب کرنا چاہتے تھے وہ لوگ مشرک ہوا کرتے تھے۔

تحریر: کیس اَرباف
ترجمہ و تلخیص: عبدالباری فلاحی
ہمدرد نگر، نئی دہلی

طبِ اسلامی

(تیسری قسط)

عہدِ زوال و انتشار

اسلام کے ابتدائی دور میں علوم و فنون کی بے مثال ترقی ہوئی لیکن مشہور مذہبی پیشوا امام غزالیؒ کے زمانے سے ان کا زوال و انحطاط شروع ہو گیا اور ذہنوں میں یہ تصور پیدا ہونے لگا کہ علوم کے مطالعے سے تخلیقِ کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں یقین و اعتماد کی پختگی میں تزلزل اور کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ تاہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ہے کہ عظیم مفکرین اور دانشوروں کی ذہنی اُٹھان کو دبانے میں صرف یہی ذہنیت کارفرما تھی یا کوئی اور بھی؟ بارہویں صدی میں کچھ روشن خیالی پیدا ہوئی اور ابنِ سینا، رازی اور مجوسی کی تصانیف کی اشاعت، تلخیص اور تشریح کا سلسلہ شروع ہوا لیکن ممتاز اور طبع زاد کتابوں کی تصنیف کم ہو گئی۔

بغداد اور قاہرہ کے درباروں اور اسپین میں زیادہ تر یہودی اطباء کی تعداد تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ یہودی اسلام کے قیود اور پابندیوں سے نسبتاً آزاد تھے۔ مثال کے طور پر مشہور یہودی طبیب، فلسفی اور مذہبی رہنما موسیٰ بن میمون (۱۱۳۵–۱۲۰۴ء) تھا۔ اس کی پیدائش اسپین میں ہوئی اور اپنی زندگی کے بیشتر ایام قاہرہ میں گزارا۔ اس کی بہترین کتاب "الفصول فی الطب" ہے جس میں اس نے جالینوس کے خیالات پر تنقید کی ہے۔ درباری ملازم کی حیثیت سے اس نے سلطان کے حفظانِ صحت کے لئے کچھ رسالے لکھے جو کہ اسلام کے بعد کی صدیوں میں طبی لٹریچر کے قابلِ فخر نمونے تصور کئے جاتے ہیں۔ عقیدۂ اسلام کا قاہرہ آزاد کورٹ پر ایک اثر تھا اور وہ میمون کی اس معذرت سے صاف واضح ہے جس کا ذکر اس نے اپنے ایک رسالے کے آخر میں کیا ہے اس میں سلطان کے سامنے پیش کردہ مشورہ کی ایک طویل علمی معذرت کی ہے وہ مشورہ یہ تھا کہ بادشاہ کو اپنے مالیخولیا کے علاج میں مسکر شراب اور موسیقی کو استعمال کرنا چاہئے۔ (اسلام کے غلبہ اور اثر کی وجہ سے اس کو معذرت خواہانہ انداز میں شراب اور موسیقی کے استعمال کا مشورہ دینا پڑا)۔

موسیٰ بن میمون کا ایک مسلم ہمعصر عبداللطیف (۱۱۶۲–۱۲۳۱ء) تھا اس نے نامور علماء سے ملاقات

کرنے اور سرزمینِ مصر کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے بغداد سے قاہرہ کا سفر کیا۔ اور مصر ہی کے تعلق سے "الافادة والاعتبار فی امور المشاہدات والحوادث المعاینات بارض مصر" نامی کتاب لکھی جس میں ۱۲۰۰ء سے ۱۲۰۲ء تک مصر کے تمام زلزلوں اور قحطوں کو بیان کرنے کے بعد قاہرہ کے شمال مغرب میں واقع ایک قدیم قبرستان کی ہڈیوں کے سلسلے میں اپنی معلومات کا ایک دلچسپ خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ Sacrum اور نچلے جبڑے کی ہڈی پر جالینوس کے بیان اور خیال کی اصلاح کی۔

اس دور میں علم الادویہ پر متعدد رسالے لکھے گئے وہ یا تو مفرد دوا پر مشتمل یا مرکب ادویہ پر۔ اور یہ مفردات پر سب سے جامع اور مشہور کتاب ابن بیطار (متوفی ۱۲۴۸ء) کی ہے۔ اور یہ مرکب پر مشتمل رسائل کو قرابادین کے نام سے موسوم کیا گیا جو کہ یونانی لفظ گرافیدیان Graphidion کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور لاطینی مخطوطات اور ابتدائی مطبوعہ کتابوں میں یہی لفظ مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ ابن بیطار جس نے بحیرۂ روم کے ساحل سے پودوں کو اور دواؤں کو جمع کیا نے اپنی کتاب "جامع الادویہ المفردہ" میں ۱۴۰۰ سے زائد نباتاتی، حیوانی اور معدنی دواؤں کو بیان کیا اور تقریباً ۱۵۰ سے زائد عربی مصنفین کی کتابوں سے مواد اخذ کیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے علم و فضل اور اس کے غیر معمولی دانشورانہ بصیرت کی دلیل ہے۔ نباتات کے موضوع پر عربی کتب میں اس سے عمدہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔

ادویہ مرکبہ پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب اب بھی پورے عالمِ اسلام میں دوا فروشوں کی حمایت میں ہیں۔ ان میں آج سب سے زیادہ مشہور کتابیں کوہن العطار (چودھویں صدی، یہودی) کی "منہاج الدکان و دستور الاعیان" اور داؤد انطاکی (متوفی ۱۵۹۹ء) کی "تذکرۃ اولی الالباب" ہیں۔ یہ دونوں قاہرہ میں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کے قدیم اور پیچیدہ نسخہ جات یورپی مطب میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اس طرح سے بہت سے نام مشرق سے مغرب میں رواج پا گئے مثلاً Rob (رُب)، Julep (فارسی میں گلاب)، Sherbet (عربی شراب)۔

چودھویں صدی کا جب آغاز ہوا تو اس وقت طب کی تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا۔ جن مسلم مصنفین نے مذہبی کتابوں سے طبی علم حاصل کیا تھا ان کی طبی تصنیفات میں جادو اور اوہام پرستانہ عملیات اور خیالات کا رنگ غالب آنے لگا۔ اس طرح مضامین کے عمومی معیار میں مزید گراوٹ شروع ہو گئی۔ اسپین میں اطباء کے درمیان فلسفیانہ اختلافات پیدا ہونے لگے۔ مثال کے طور پر دو مسلم اطباء ابن

وہ ابن رشد کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابن زہر (متوفی ۱۱۶۲ء) المہدی حکمران کے دربار کا ایک شاہی معالج کا طبیب تھا۔ اس کو علم جراحت اور جراحوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ جنرل پریکٹشنر کے بالمقابل کنسلٹنگ فزیشن (consulting physician) کی حیثیت سے زیادہ مقبول تھا۔ طب پر اس کی اہم تصنیف "کتاب التیسیر" ہے۔ لاطینی ترجمہ پاراویسیس (Paravicius) نے ۱۲۸۰ء میں ایک یہودی کی مدد سے کیا اور اس کا نام Theisir رکھا جس کی وینس میں کئی بار اشاعت ہوئی۔ یہ کتاب آزادی فکر اور مصنف کی ذہانت کا واضح ثبوت ہے۔ اس میں زیادہ تر ابن زہر کی ذاتی تجربے شامل ہیں کیونکہ بقول اس کے تجربے ہی معالج کا صحیح رہنما ہوتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اہل عرب کو یورپ کے مقابلہ میں کامیابی کم نصیب ہوئی۔

ابن رشد قرطبہ میں ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا۔ اور مراکو (Morocco) میں ۱۱۹۸ء میں انتقال ہوا۔ یہ ابن زہر کا بہترین دوست اور شاگرد تھا اور ارسطو کے فلسفہ کا قائل تھا۔ اس نے طب کے موضوع پر تقریباً ۲۰ کتابیں لکھیں جن میں سے صرف ایک کتاب کا لاطینی ترجمہ کافی مشہور ہوا اور وہ ہے "کلیات فی الطب"۔ اسکو لاطینی زبان میں بوناکوسا (Bonacosa) نامی یہودی نے ۱۲۵۵ء میں Colliget کے نام سے منتقل کیا۔ ابن زہر کی کتاب کے ساتھ اس کی بھی کئی مرتبہ اشاعت ہوئی۔ ابن رشد ہر جگہ اپنی کتاب میں خود کو ایک ارسطاطالیسی مفکر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے بالخصوص کتاب کے دوسرے حصہ میں جہاں وہ نفسیات اور فزیالوجی سے بحث کرتا ہے۔

چودہویں صدی میں جب بڑے پیمانے پر طاعون پھیلا تو سپین میں مسلم اطباء کے اندر علمی بیداری پیدا ہوئی۔ انھوں نے ان لوگوں کے خیال سے قطعی اتفاق نہیں کیا جو طاعون کو عذاب الٰہی اور متعدی بیماری تصور کرتے تھے۔ اس کا ذکر غرناطہ کے مشہور سیاستدان اور طبیب ابن الخطیب (۱۳۱۳ء-۱۳۷۴ء) نے اپنے رسالہ "الطاعون" میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"متعدی مرض کے وجود کا پتہ چلتا ہے وہ اصل مطالعہ، تجربہ، مشاہدہ سے یا قابل اعتبار رپورٹ کے ذریعہ جس سے یہ ثبوت ملے کہ لباس، برتن اور کان کی بالی کے استعمال سے بیماری منتقل ہوتی ہے یا اسکے پھیلنے سے جس کا سلسلہ ایک گھر کے افراد کے ذریعہ شروع ہوتا ہے یا ایک صاف ستھرے بندرگاہ کے تعدیہ سے جو کہ متعدی زمین سے گزر کر وہاں تک پہنچتا ہے یا الگ تھلگ فرد کی immunity سے

یا افریقہ کے بدوی قبیلے سے۔ یہ اصول ذہن نشین ہونا چاہیے کہ جب روایات سے کوئی ثبوت اخذ کیا جاتا ہے تو اس میں ترمیم اور تنسیخ بھی ہو سکتی ہے اگر اس کے برعکس کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔"

یہ ایک قدیم خیال تھا جس کو ابن الخطیب نے تحریر کیا۔

مریہ کے طبیب ابن خاتمہ (متوفی ۱۳۶۹ء) نے "طاعون" پر ایک کتاب لکھی کیونکہ اس طاعون نے ۱۳۴۸ء-۱۳۴۹ء میں اسپین کے شہر المیریا (Almeria) میں کافی تباہی پیدا کی۔ یہ رسالہ ان تمام رسالوں سے بہتر ہے جن کو چودہویں اور سولہویں صدی کے درمیان یورپ (طاعون) پر ایڈیٹ کیا گیا۔ وہ ایک جگہ یوں رقمطراز ہے:

"میرے طویل تجربہ کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مریض کے تعلق میں آجاتا ہے تو اس پر فوراً اس مرض کا حملہ ہوتا ہے۔ وہ وہی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر وہ نفث الدم کا مریض ہے تو اس کے پاس رہنے والا اس مرض میں گرفتار ہو جائے گا۔ اگر اس کے غدود ملتہب ہو گئے ہوں تو دوسرا بھی اسی میں ملوث ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ ناسور میں مبتلا ہے تو وہی مرض اپنی علامات کے ساتھ دوسرے قریبی شخص پر ظاہر ہوگا اور منتقل مرض کا یہ سلسلہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہے گا۔"

ان مصنفین کے خیالات لائق تحسین ضرور ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یونانی اطباء نے مرض کے متعدی ہونے کی صفت کے اصول پر مکمل طور سے زور نہیں ڈالا۔ اور عہد وسطی کے بہت سے مصنفین نے اس کو تقریباً نظر انداز کر دیا۔

اب میں آخر میں اسلامی طب اور سائنس کی تاریخ سے متعلق دو اہم کتابوں پر اجمالی روشنی ڈالوں گا۔ سب سے پہلے ابن القفطی (متوفی ۱۲۴۸ء) کی کتاب "اخبار الحکماء" کا ذکر آتا ہے جس میں اس نے یونانی، شامی اور اسلامی اطباء، منجمین اور فلاسفہ میں سے ۴۱۴ افراد کے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔ یہ یونانی لٹریچر کے علاوہ ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے یونان کی قدامت کا بھی طرح اندازہ ہوتا ہے جو کلاسیکل ماخذ میں باقی نہیں رہی۔

دوسری اہم تاریخی کتاب کا نام "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ہے جس کو ابن ابی اصیبعہ متوفی ۱۲۵۰ء جیسے حاذق طبیب اور ماہر امراض چشم نے لکھ کر عالمی شہرت حاصل کی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قاہرہ میں گزارا۔ اپنی کتاب میں اس نے تقریباً ... طبیبوں کے حالات زندگی اور ان کے کارنامے

ا (Gynaecology) اور علم ولادت (Obstetrics) سائنٹفک مطالعہ کے مضامین بن گئے۔ علم امراض چشم (ophthalmology) ناکارہ لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر تعلیم یافتہ اطباء کی زینت بن گیا۔ دیانا (Vienna) میں ۱۵۲۰ء میں اور فرینک فورٹ (Frankfurt) میں ۱۵۸۸ء میں طب کا جو نصاب تھا وہ بہت حد تک ابن سینا کی 'القانون فی الطب' اور رازی کی کتاب المنصوری کے نویں حصہ پر مشتمل تھا۔ فرانس اور جرمنی میں ساتویں صدی عیسوی تک کچھ اسکالر عربی تعلیم کے حصول میں لگے رہے۔ عربی اور یونانی زبان کے ماہرین کے درمیان شمالی اٹلی میں جدوجہد اس وقت تک جاری رہی جب تک جدید سائنٹفک طریقہ کے ظہور اور آغاز نے دونوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جہاں تک عربی مادہ کو (علم الادویہ) کا تعلق ہے یہ انیسویں صدی تک زندہ رہی۔ ابن بیطار کی کتاب 'ادویہ مفردہ' کے لاطینی ترجمے کے کچھ حصے ۱۷۵۸ء میں کریمونا میں طبع ہوئے۔ تقریباً ۱۸۳۰ء تک یورپ قرابادین کو استعمال کرنے کے لئے سرافیون (Serapion) اور ماسویہ اردنی (Mesue the younger) کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا اور خلاصہ تیار کیا گیا۔ یونانی، عربی اور ایرانی ماخذ سے آرمینی زبان سے طب کی جمع و ترتیب کا کام Mechithar نے ۱۱۸۴ء میں انجام دیا اور وہ کتاب وینس میں ۱۸۳۲ء میں دوبارہ طبع ہوئی۔ موتیا بند کو ایک سوئی (needle) سے آپریشن کرنے کا جو قدیم طریقہ تھا جیسا کہ اسکندریہ کے Antyllos نے بیان کیا اور رازی اور علی ابن عیسیٰ نے دوسروں تک منتقل کیا اس طریقہ پر Percivall Pott نے انگلینڈ میں ۱۷۸۰ء میں عمل کیا اور جرمنی میں اس کے بعد بھی ۱۸۷۰ء تک عمل ہوتا رہا۔

مشرقی اسلام میں قدیم سائنسی اور طبی روایت اب بھی گاؤں کے حجاموں کے درمیان مقبول طب کی حیثیت سے زندہ ہے۔ مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ جس دن اس نے ان سطروں کو لکھا اسی روز قاہرہ میں ایک آدمی کو دیکھا جس کے موتیا بند کا آپریشن گھوم گھوم کر طبی مہارت کا پرچار کرنے والے ایک موڈانی شخص نے ابن سینا اور Antyllos کی ہدایات کے مطابق کر رہا تھا۔ مراکو (Morocco) سے ہندوستان تک کے تمام قومی دوافروش عادۃً اپنی مفید دواؤں کو عربی اطباء کے قرابادین کے مطابق تحریر کرتے ہیں۔

اگر ہم پیچھے کی طرف نظر ڈالیں تو بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی طب اور سائنس نے یونانی

(بقیہ ص ۷۰ پر)

تعارف و تبصرہ

اقامت دین کا کام —— کہاں اور کیسے ہو؟

شبیر احمد منظر قدوسی — ادارہ صدائے سحر بنگلور ۴ کرناٹک، ہند

”تحریک اسلامی کا کارکن غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس وسیع و عریض سرزمین میں ایک چھوٹا سا خطۂ زمین ایسا بھی ہے جہاں دین حق کو اس کی ساری جزئیات کے ساتھ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کروڑوں انسانوں کی آبادی کے اندر ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے پورے نظام زندگی کو دین کی بنیاد پر بڑی آسانی کے ساتھ بدلا جاسکتا ہے وہ خطۂ زمین اور وہ آبادی اس کا اپنا گھر ہے۔“

یہ اقتباس اقامت دین کا کام — کہاں اور کیسے ہو؟ نامی کتاب سے ہے، جو کہ ۹۲ صفحات پر مشتمل $\frac{20\times30}{16}$ سائز کی یہ کتاب تحریک اسلامی کے کارکنان کو دعوت فکر دیتی ہے اور اس کا مصنف تحریک اسلامی کے کارکنان سے ڈائرکٹ مخاطب ہے۔ وہ سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے، اور جواب نہ ملنے پر افسوس اور سر دھنتے کے ساتھ رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اسلام کا نفاذ اپنے آپ سے شروع کرو، اپنے گھر سے ابتدا کرو اور اصلاح اپنے قریبی معاشرے اور سماج کا کرو پھر ریاست کی تشکیل کا خواب دیکھو۔ بدقسمتی سے ہم نے ترتیب الٹ دی ہے، ریاست کی تشکیل پہلے اور معاشرہ و سماج کو بعد میں رکھا ہے اور سب سے آخر میں اپنی ذات کو رکھا ہے۔

شبیر احمد منظر قدوسی شیموگہ ضلع کرناٹک کے رہنے والے ہیں۔ ایک عرصہ تک جماعت اسلامی کے ناظم علاقہ رہ چکے ہیں، ور صدائے سحر ہفت روزہ اور پھر ماہنامہ کے ایڈیٹر بھی اور اب ایک اسلامیہ عربک کالج سفورہ کے روح رواں اور تعلیمی کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، یہ مدرسہ جماعت اسلامی کی سرپرستی میں تین سال پہلے قائم ہوا ہے اور کارکردگی ماشاءاللہ بہت عمدہ ہے۔ اس کتاب میں ان کا خلوص ان کی محبت اور سوز دروں سب سمٹ گیا ہے، تحریک کے ہر کارکن کے لئے یہ کتاب ضروری ہے۔

(بقیہ ص [illegible])

عبید اللہ فہد

حلقۂ یاراں

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

نومبر کا رسالہ اوّل تا آخر پڑھا۔ برادر انوار احمد اور طارق بھوپالی کے حادثات پر نہایت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے مرحومین کے لئے دعائے مغفرت ہے۔ رسالہ کی کتابت وطباعت پچھلے ماہ سے بہتر ہو رہی ہے۔ ایک بات جو مسلسل رسالہ کے معیار کے سلسلہ میں کھٹکتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ تحقیقی مقالات کے بجائے ماخوذ بہت آرہے ہیں اور یہ رسالہ کے شان کے خلاف ہے جس سے آپ بھی اتفاق کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افغانستان کی رپورٹنگ وغیرہ یا مکالمۃ الصدرین وغیرہ نوعیت کے مضامین محض اخباری وصحافتی قسم کے ہیں ان رپورتاژ کے لئے دعوت، افکار ملی، دوام، نوائے وغیرہ بہت سے تحریکی رسائل اور اخبارات ہیں آخر حیات نو کو کیوں ان سے مزین بنایا جائے؟ جبکہ اس طرح کے مضامین دوسری جگہوں پر آتے رہتے ہیں اس سے رسالہ کی انفرادیت قائم نہیں رہتی اور اس کے وجود کی افادیت وضرورت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ کیا تعلیمی وتدریسی مسائل کو جب یا فہم قرآن وتدبر قرآن وحدیث وغیرہ علمی وتحقیقی مباحث نہیں شروع کئے جا سکتے جو جامعۃ الفلاح کی بھی ترجمانی کریں اور رسالہ کے انفرادی ذکر بھی باقی رکھیں۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کو مضمون نگاروں سے شکایت ہوگی یا طلباء واساتذہ کی عدم توجہی کا شکوہ ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر تھوڑی سی توجہ دیں تو یہ کمی بھی پوری ہو سکتی ہے۔ عبدالباری فلاحی کا ترجمہ چھپا ہے۔ مواد تحقیقی ہے لیکن غزلوں کے بچو مرنے رسالہ کی نوعیت کو مشتبہ بنا دیا ہے۔ لیل ونہار کا کالم خاصا جاندار ہے۔ بہت سی خبریں ایک ساتھ مل گئیں۔ جاوید اشرف صاحب اور اقبال احمد صاحب کی جامعہ میں آمد سے طبیعت خوش ہوئی۔ اب جامعہ کے معیار تعلیم وتربیت کو بڑھانے میں ایڈوانس کا کام ہے۔ جامعہ میں تو مسیحی خطبات کے پروگراموں کا حال معلوم نہ ہو سکا اگر جامعہ نیاز جو مسلم یونیورسٹی کے ماہرین علم وتحقیق کو وہاں لاکر ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں کے ذمہ داروں سے بات کیجئے تو یہاں سے اساتذہ جانے کو تیار رہیں۔ مولانا نور محمد صاحب کو سلام کہیں۔ والسلام

ادارہ

جامعہ کے لیل ونہار

درس وتدریس کا بہترین ماحول ششماہی امتحان کے نتائج سنا دیئے گئے ہیں اور ایک بار پھر طلباء اور اساتذہ درس وتدریس میں منہمک ہو گئے ہیں۔ اس وقت جامعہ میں تعلیم وتعلم کا بہترین ماحول ہے اور ہر ایک افادہ واستفادہ میں مصروف ہے۔

علی گڑھ فلاح یونٹ کی سرگرمیاں ۱۶ / ۱۰ / ۸۶ کو فلاح یونٹ علی گڑھ کی ایک انتخابی میٹنگ ہوئی جس میں مظفر حسین فلاحی صدر اور شوکت علی فلاحی سکریٹری منتخب ہوئے۔

۲۸ / ۱۰ / ۸۶ کو حیات نو کے مدیر طارق فاروق فلاحی کی آمد پر ایک تعارفی نشست ہوئی جس میں موصوف نے حیات نو کی توسیع واشاعت پر زور ڈالا۔

۲۹ / ۱۱ / ۸۶ کو استاد محترم مولانا اقبال صاحب کی تشریف آوری پر ایک اجتماعی ملاقات کا پروگرام رکھا گیا۔ اس موقع پر موصوف نے انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ہی جامعہ کے نمائندے اور ثمرہ ہیں۔ آپ کے ہی علم وعمل سے جامعہ کو پہچانا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ درحقیقت ہم جو بھی بیان کر دیتے ہیں یا کریں گے اس کی بنیاد وہی ہے جو جامعہ نے ڈالی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کا خیال رکھیں۔ (شوکت علی سکریٹری)

بزم حیات نو برادر مظفر حسین فلاحی صدر، برادر شوکت علی فلاحی سکریٹری نیز عبد الحفیظ فہد اور دوسرے تمام فلاحی برادران کے تعاون سے علی گڑھ میں ایک "بزم حیات نو" بنائی گئی تاکہ علی گڑھ میں رسالہ کا تعارف کرایا جا سکے اور لوگوں سے مختلف طرح کا تعاون حاصل کیا جا سکے۔ الحمد للہ اس سلسلہ کا پہلا سیمینار ۳۰ / دسمبر ۸۶ء کو محسن الملک ہال کے کامن روم میں منعقد ہوا جس میں سید قطب ایک عظیم اسلامی مفکر کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا گیا۔ مقالہ عبید اللہ فہد نے پیش کیا۔ شرکاء نے مقالہ کی جامعیت اور اسلوب کی بڑی تعریف کی۔ اس سیمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر عبد العلیم ندوی تھے آپ المجمع العلمی العربی دمشق کے رکن، وجواہر لال یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔

میں آپ کے عربی ادب کے ارتقاء اور مسائل پر کئی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر راشد ندوی نے اس سیمینار کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ آپ شعبۂ عربی کے بھی صدر ہیں۔ آپ نے فرمایا، سید قطب ایک مرد آہن تھے، انھوں نے زمانے سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا وہ ادب کے میدان میں بھی منفرد و ممتاز تھے اور تحریک، دعوت اور شہادت کے میدان میں بھی منفرد و ممتاز۔ انھوں نے کبھی مصالحت و مداہنت سے کام نہیں لیا۔

ادارہ ادب اسلامی کے ایک سرگرم رکن عزیز بگھروی کی آمد

صالح، پاکیزہ اور بامقصد ادب کے ترجمان ادارہ ادب اسلامی کے سرگرم کارکن، تحریک اسلامی کے بلند پایہ اور استاذ شاعر جناب عزیز بگھروی صاحب بلریا گنج تشریف لائے اور جامعہ کے طلبہ اور صاحب ذوق اساتذہ کو استفادہ کا موقع فراہم کیا اور کئی نشستوں میں اپنی غزلوں کا تحفہ پیش کر کے شاعری کے ایک نئے طرز اور نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔

شہود عالم فلاحی اور علی احمد فلاحی کو صدمہ

یکم دسمبر ۲۰۰۶ء کو جناب شہود عالم فلاحی کے والد محترم جناب محبوب عالم صاحب صدیقی کا دماغ کی رگ پھٹ جانے سے دو دن بے ہوش رہنے کے بعد ۳ر دسمبر کو صبح سات بجکر ۳۵ منٹ پر ۹۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ تہجد گذار اور ایک نیک دل انسان تھے۔ اپنے علاقہ میں تحریک اسلامی کا تعارف کرایا اور مخالفت برداشت کرتے رہے۔ آپ تحریک اسلامی میں متفق کی حیثیت سے شامل رہے۔ قارئین حیات نو سے دعاء مغفرت کی درخواست ہے۔ خدا موصوف کو معاف فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

برادر علی احمد فلاحی کٹہاری کی والدہ ماجدہ کا ۲۰ر دسمبر ۲۰۰۶ء بروز جمعہ صبح ۹ بجکر ۲۰ منٹ پر انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قارئین سے دعاء مغفرت کی درخواست ہے۔ خدا مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

> حیات نو میں تعمیری، دینی، ادبی، معلوماتی، علمی، تحقیقی، تاریخی اور تجزیاتی مضامین قبول کیے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔
>
> (ادارہ)